کچھ کسی سے ہوئی کچھ کسی نے بیاں کی ہے
مجھ کو اب سے نہیں میری یا اس کی ہے

ایک کمیونسٹ کی کتھا (ناول)

حدیثِ دل

عبداللہ ملک

ایک کمیونسٹ کا روزنامچۂ حج

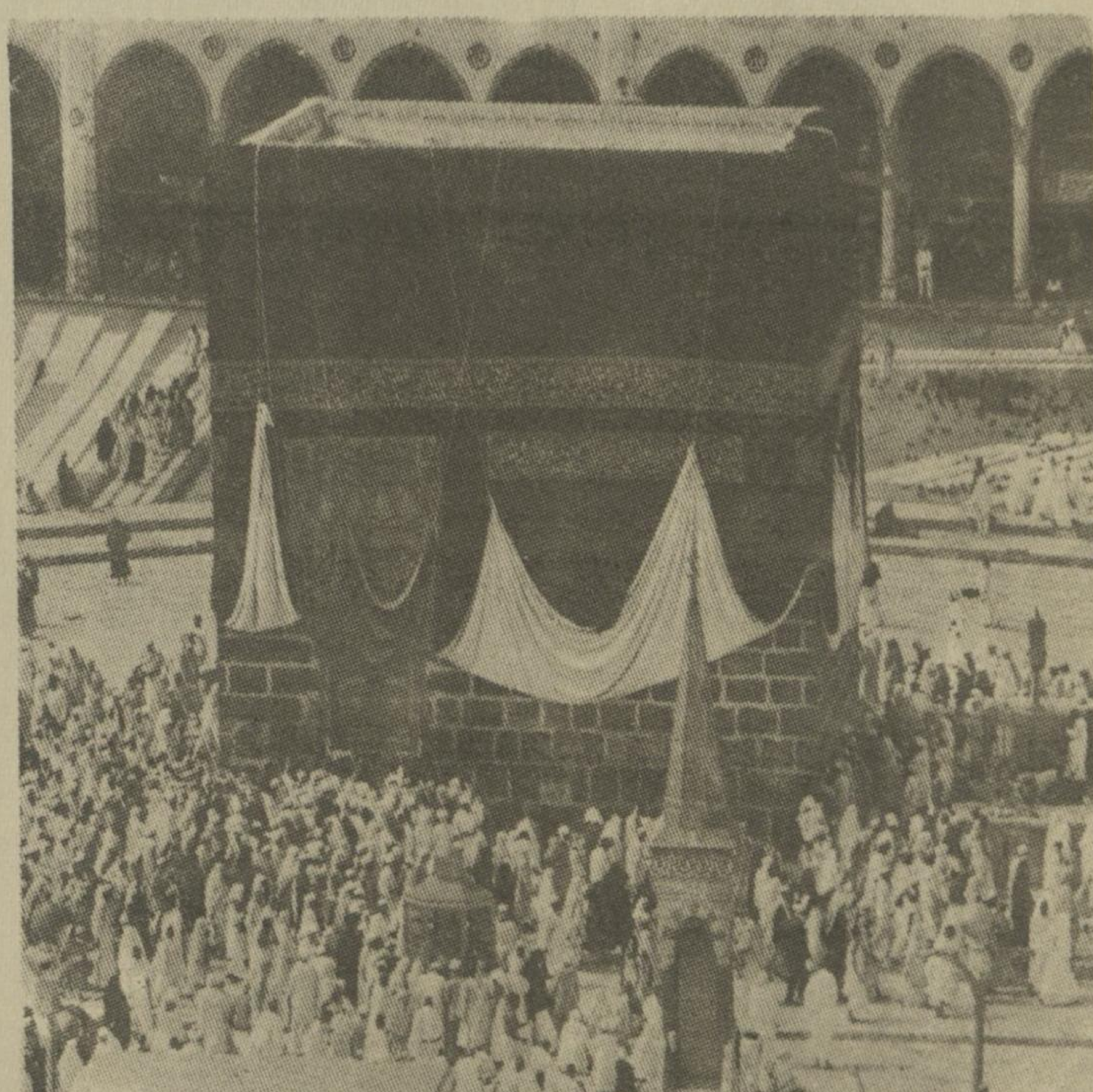
حدیثِ دل

باراوّل ـــــــ تعداد ایک ہزار
صفحات ـــــــ ۲۰۸
قیمت ـــــــ پچاس روپے
پبلشر ـــــــ کوثر پبلی کیشنز
مطبع ـــــــ کاسموپرنٹرز، لاہور

کوثر پبلیکیشنز ـــ شوکت حیات کالونی
فون ـ ۳۵۱۴۰۰ ماڈل ٹاؤن، لاہور

سیّد سبطِ حسن کے نام





مصنّف کی دیگر کتب

بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہدِ آزادی — قیمت ۳۰ روپے

پنجاب کی سیاسی تحریکیں — نیا ایڈیشن — قیمت ۳۰ روپے

داستانِ دار و رسن — نیا ایڈیشن — قیمت ۳۰ روپے

کیوبا سے چند خطوط — زیرِ طبع

مولانا احمد علی لاہوریؒ — زیرِ طبع



عبداللہ ملک و عائشہ بیت اللہ شریف کے دروازے پر

میرے دادا بڑے متشدد اہل حدیث تھے۔ وہ اہل حدیثوں کی سب سے بڑی مسجد چینیانوالی کے ٹرسٹی تھے اور مرتے دم تک وہ اِس عہدے پر فائز رہے بلکہ ۱۹۴۲ء میں جب ان کی وفات ہوئی تو ان کی جگہ مجھے ٹرسٹی چن لیا گیا لیکن بعد میں میری سیاست نے مجھے اس سے بے تعلق کر دیا۔ میرے دادا غزنوی خاندان کے بہت ہی معتقد تھے۔ اس زمانے میں اہل حدیثوں کے دو ہی اہم مکاتیب تھے۔ ایک مولانا ثناء اللہ امرتسری کا دوسرا غزنویوں کا۔ میری جب چشمِ ہوش وا ہوئی تو اس وقت چینیانوالی مسجد میں خطابت کے فرائض مولانا عبدالواحد غزنوی ادا کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس سے غالباً تجاوز کر چکی تھی لیکن مجھے ان کی امامت میں نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہے اور میں نے فجر کی نمازیں بھی ان کے پیچھے ادا کی ہیں۔ وہ فجر کی نماز بہت ہی زیادہ خشوع و خضوع سے ادا کیا کرتے تھے اور سجدوں میں گڑگڑاتے رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چینیانوالی مسجد میں فجر کی نماز کی طوالت کا بہت ہی چرچا ہوتا تھا۔ ان کے جمعہ اور عیدین کے خطبات اب بھی مجھے یاد ہیں۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عزوجل کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی کھنک دار اور بارعب آواز کی گونج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ ان کا نورانی چہرہ، سفید شفاف رنگ، سفید دودھیالی داڑھی، قد آدم عصا، سفید لباس، تنگ پائنچے کی شلوار اور گھٹنوں کے نیچے تک عربوں کا سا کرتہ اور جمعہ کے خطبہ کے دوران کا عربوں کا سا چغہ یہ سب باتیں مجھے اب تک یاد ہیں۔ نمازوں میں خشوع و خضوع، رقت کی عادت اور گڑگڑانا، انہیں کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ مولانا عبدالواحد سے میرے خاندان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا بیمار پڑے اور ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو میرے دادا مولانا کو اپنے گھر لے آئے اور خود ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

ایک طرف میرے خاندان کا غزنوی خاندان سے عقیدت و احترام کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف

میرے خاندان کے مولانا احمد علیؒ کے خاندان سے بھی بہت ہی گہرے مراسم تھے۔ مولانا احمد علیؒ کی زوجہ محترمہ اکثر ہمارے گھر آیا جایا کرتی تھیں اور میری دادی مرحومہ بھی اکثر ان کے ہاں جایا کرتی تھیں غمی اور خوشی میں مولانا اور ان کی اہلیہ ہمیشہ ہی بالالتزام شریک ہوا کرتے تھے اور اب بھی اس خانوادے کے ساتھ میری عقیدت اور احترام بدستور قائم ہے۔ مولانا احمد علی کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ حبیب اللہ سے تو میرے بہت ہی گہرے دوستانہ مراسم تھے اور اب مولانا عبید اللہ انور سے میری اور میرے بیوی بچوں کو گہری عقیدت ہے

ان دونوں مذہبی خاندانوں سے میری عقیدت اور احترام قائم رہنے کی ایک اور بھی بنیادی وجہ سیاست سے دلچسپی تھی۔ علماء کے ان دونوں خاندانوں نے بعد میں سیاست میں اچھا خاصا اہم رول ادا کیا۔ صرف سیاست ہی میں نہیں بلکہ "شرک اور فسق و فجور" کی جو یلغار اور ابن سعود کی مملکت کے خلاف جو مہم ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک یہاں چلی اس کو ان دونوں خانوادوں نے مل کر ہی روکا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس میں مولانا احمد علیؒ کی خدمات غزنوی خاندان سے کہیں زیادہ ہیں۔ مولانا احمد علیؒ عقیدتاً حنفی تھے اور دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن "بریلویوں" کے نزدیک دیوبندی بھی وہابی ہی تصور ہوتے تھے چنانچہ ہر وہ مکتبِ خیال جو سلطان ابنِ سعود کے قبّے گرانے کی مہم کی حمایت کرتا تھا اس کو یہاں کے کچھ سیاسی اور مذہبی علماء وہابی کا لقب دے کر عوام میں معتوب ٹھہرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک اس ضمن میں باقاعدہ مناظرے بھی ہوتے رہے اور مناظروں کا موضوع مذہبی ہوتا تھا۔ اس مہم میں مولانا احمد علی نے بارہ بارہ اور سولہ سولہ صفحات کے درجنوں پمفلٹ رقم کئے جو بہت ہی معمولی قیمت پر عوام تک پہنچائے گئے اور اس طرح انہوں نے لاہور کی فضا کو بدلنے میں اہم رول ادا کیا۔ مقابلے پر بریلوی مولوی دیدار علی اور ان کا گروپ تھا اور ان کا مرکز وزیر خان کی مسجد ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں مولانا احمد علی نے تعلیم یافتہ لوگوں کی تربیت کے لئے جو عام طور پر ملازمت میں ہوتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اسی درس نے باقاعدہ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک خاصا بڑا گروہ پیدا کیا۔ اسی طرح مولانا داؤد غزنوی نے بھی رات کے درس کا اہتمام کیا تھا لیکن مولانا داؤد غزنوی درس و تدریس کے سلسلے کو کم اہمیت دیتے کیونکہ مولانا داؤد غزنوی کو سیاست سے کہیں زیادہ شغف تھا۔ اور مجلس احرار میں ہمیشہ مولانا احمد علی سے کہیں زیادہ سرگرم رہے اس لئے وہ درس و تدریس اور جمعیت اہل حدیث کے تبلیغی کاموں میں کبھی بھی پوری طرح دلچسپی نہ لے سکے جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ شروع دن ہی سے جمعیت اہل حدیث میں ٹرسٹیوں کے ایک گروہ اور مولانا داؤد میں ایک قسم کی کھینچا تانی جاری رہی، یہ گروہ اس بات پر مصر تھا کہ مولانا اگر سیاسی جھمیلوں سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتے تو پھر وہ مسجد چینیاں والی کے خطیب کی ذمہ داریوں سے الگ ہو جائیں۔ مولانا اس کے لئے تیار نہیں تھے وہ سیاست میں بھی سرگرم رہنا چاہتے تھے اور چینیاں والی مسجد کی خطابت بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے بہر حال یہ کش مکش جمعیت اہل حدیث میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

ان کے مقابلے میں مولانا احمد علی بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ وہ اپنی پوری توجہ درس و تدریس کو دیتے وہ سیاست میں مجلسِ احرار اور جمعیت العلمائے ہند کے ہمنوا تھے لیکن سرگرم نہ تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد علی کے عقیدت مندوں کا حلقہ کہیں زیادہ وسیع ہو گیا۔ مولانا احمد علی کی پابندئ سنت کا یہ عالم تھا کہ جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ منٹو پارک میں جمعیۃ اہل حدیث کے زیر اہتمام عیدین کی نماز ادا کرتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاگردوں اور مریدوں کا بھی ایک بہت ہی وسیع حلقہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی قائم کر لیا۔ انہوں نے ایک طرف اپنے زہد و تقویٰ سے دوست اور دشمن کو متاثر کیا۔ دوسری طرف انھوں نے تحریر میں بھی کئی ایک کارنامے سرانجام دیئے سب سے بڑھ کر تو ان کی تفسیر ہی ہے اور پھر مدرسہ قاسم العلوم

لاہور میں ایک طرح سے تین عالموں مولانا داؤد غزنوی، مولانا احمد علی اور مولانا غلام مرشد نے قریب قریب ایک ہی دور میں اپنے علمی اور تبلیغی کام شروع کئے اور تینوں بہت حد تک مسلک میں بھی ایک دوسرے کے قریب تھے لیکن زہد و تقویٰ، ریاضت اور خدمتِ دین میں مولانا احمد علی سب کو پیچھے چھوڑ گئے اور لطف یہ ہے کہ صرف مولانا احمد علی ہی کا خانوادہ ہے جو دین کی اس شمع کو روشن رکھے ہوئے ہے۔

میرے خاندان کو جو مذہب سے لگاؤ تھا اس نے ان کی سیاسی وابستگیوں کو بھی ترتیب دیا تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ تمام لوگ جن کا اہل حدیث مکتبِ فکر سے تعلق تھا وہ کسی نہ کسی سمت سے مولانا ابوالکلام سے متاثر تھے چنانچہ ہمارا خاندان بھی ہزاروں خاندانوں کی طرح مولانا ابوالکلام کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ٹھہرا، اسی زمانے میں بیرون شیرانوالہ دروازہ کی ایک الہلال بک ایجنسی نے مولانا ابوالکلام کے خطبات اور "قولِ فیصل" جو ان کا عدالت میں بیان تھا جس کو پمفلٹوں کی صورت میں شائع کرنا شروع کیا چنانچہ ہمارے گھر میں بھی یہ پمفلٹ آتے مجھے اس زمانہ میں کوئی زیادہ شعور نہ تھا لیکن جتنا بھی شعور تھا اس نے ان خطبات سے گہرا تاثر قبول کیا اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی میں ان تاثرات کو اپنی زندگی کا گراں مایہ اثاثہ تصور کرتا ہوں اور آج بھی مجھے مولانا کے عدالتی بیان

کے کچھ حصے از بر ہیں۔ جب انہوں نے عدالتوں کی قدیم تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عدالتیں اور قرونِ وسطیٰ کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے ان سے ہمارے زمانہ کو نجات مل گئی وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خودغرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں...... اس جگہ (عدالت) کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لئے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خوابگاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پاتے اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لئے دعائیں مانگتے" جس الزام کو اس مقدمہ کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اس کے متعلق انہوں نے کہا کہ "ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا کہ اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں.... یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش تو قابلِ ملامت نہیں۔

ہندوستان میں بھی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق قرار دے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔" اسی بنا پر جب ان کی تفسیر کی پہلی جلد ترجمان القرآن کے نام سے شائع ہو کر بازار میں آئی تو غالباً میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے ضد کر کے خریدی صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے گھر میں اخبارات اور رسائل بھی آتے رہتے جن کے مطالعہ کا میرے والد مرحوم اور دادا مرحوم کو بہت ہی شوق تھا چنانچہ مجھے مولانا داؤد غزنوی کا ہفتہ وار رسالہ "توحید" ابھی تک یاد ہے۔ یہ امرتسر سے شائع ہوتا تھا اور بذریعہ ڈاک ہر ہفتے ہمیں ملا کرتا تھا۔ اس پرچے نے بھی مجھ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

پھر مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب ۱۹۲۶ء کے قریب سلطان ابن سعود کے خلاف ہندوستان میں مہم چلی تھی کہ اس نے قبّے گرا دیے ہیں اس بنا پر ہندوستان کی مسلمان قیادت یعنی خلافت کمیٹی میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک طرف سلطان ابنِ سعود کا حامی گروہ تھا جس کی قیادت مولانا ابوالکلام کر رہے تھے اور اس گروہ میں تمام وہی لوگ تھے جو بعد میں احرار کے نام سے موسوم ہوئے دوسری طرف مولانا محمد علی شوکت علی اور ان کی خلافت کمیٹی تھی۔ ہمارا خاندان چونکہ غزنوی خاندان کا معتقد تھا اور سلطان ابن سعود کا سب سے بڑا حامی خود غزنوی خاندان تھا بلکہ ان کے تو سلطان سے مراسم تھے اور سلطان ابن سعود اس خاندان اور اس کے ذریعے اہل حدیثوں کی بھی تھوڑی بہت مالی امداد کیا کرتے تھے اس لیے ہماری تمام ہمدردیاں سُلطان ابن سعود کے ساتھ تھیں ویسے اس زمانہ میں خود انگریزی حکمتِ عملی بھی سلطان ابن سعود کو مستحکم نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے انگریز کو سلطان ابن سعود کے خلاف مدد دیتی تھی چنانچہ سلطان ابن سعود کی حمایت انگریز دشمنی کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ اس نے بھی ہمارے خاندان کو انگریز دشمن حلقوں میں کھڑا کر دیا۔ اس زمانے میں سلطان ابن سعود کے حامیوں کا مرکز بھی چینیانوالی مسجد تھی اور اس کے کئی ایک جلسے ہمارے مکان پر بھی ہوتے تھے۔

اب میں اس زمانے کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۲۰ء اور اس کے ارد گرد کے زمانے کا جو کرب تھا اس کرب نے مجھے مختلف سمتوں سے متاثر کیا ہے اور یہ صرف مذہب کی راہیں نہیں تھیں بلکہ دوسری راہوں سے بھی مجھے سیاست اور ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی میرے گھر کا ماحول اگر ایک طرف مذہبی تھا تو دوسری طرف اس پر سیاست اور ادب کی بھی گہری چھاپ تھی۔ میرے والد مرحوم کے قریبی حلقۂ احباب میں شیخ غلام مصطفےٰ حیرت، ملک لال دین قیصر جو مارشل لاء کے زمانے میں ڈنڈا فوج کے سالار تھے اور ان کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد مرحوم عملی سیاست میں حصہ نہ لینے کے باوجود سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان کے دوستوں میں ملک لال دین قیصر اور غلام مصطفےٰ حیرت دونوں شاعری بھی کرتے تھے اور ان کی پنجابی کی نظمیں ایک دور میں چھپتی بھی رہی ہیں اس کے بعد ملک لال دین قیصر اور شیخ غلام مصطفےٰ ایک حد تک کل وقتی سیاسی کارکن بن گئے اور ہر جماعت اور قائد کو شہر کے اندر اپنے اثر و رسوخ کے

لیے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چنانچہ پنجاب کے مسلمانوں کے لیے چھپن فیصدی نمائندگی کے حصول کی تحریک جو چھپن فیصدی کے نام سے موسوم ہوئی اور اسی طرح علم الدین شہید کی نعش کی واپسی اور روزنامہ آکا باکا کا اجراء۔ یہ تمام واقعات ان شخصیتوں کے صحافت اور سیاست سے دلچسپی کے عکاس ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ادب کا چرچا بھی اس گروہ میں خوب ہوتا تھا۔ چنانچہ شیخ غلام مصطفےٰ اجیرت اور بدرالدین بدر کی ادارت میں ایک ماہوار رسالہ فردوس بھی نکالا گیا تھا اس میں ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مجید ملک، چراغ حسن حسرت بھی لکھا کرتے تھے ان دنوں شیخ غلام مصطفےٰ اجیرت کی سٹیشنری کی دکان جو مشن اسکول رنگ محل کے سامنے مسجد مولوی فضل الٰہی کے نیچے ہوا کرتی تھی وہ ان دانشوروں کی بیٹھک کے لیے مخصوص تھی یا پھر کوچہ چابکسواراں کے اندر شیخ غلام مصطفےٰ اجیرت نے اپنے مکان کے پاس ہی ایک بیٹھک کرائے پر لی ہوئی تھی۔ اس میں فردوس کا دفتر ہوتا تھا۔

ادب کے چرچے میں ہمارا محلہ کافی نامور رہا ہے اس ادبی ماحول نے بھی مجھ پر اثر ڈالا۔ ایک طرف یہ محلہ پنجابی کے نامور شاعر ہدایت اللہ کا مسکن تھا تو دوسری طرف تحقیقات چشتی کے خالق مولوی نور احمد چشتی اور ان کا خانوادہ بھی ہمارا ہمسایہ تھا۔ ان کے خانوادے میں ہی بعد میں محرم علی چشتی اور پھر ابراہیم علی چشتی جیسے لکھنے والے پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر اجمل نے ان کا نام روشن کیا ننھیال سے ان کا تعلق مولوی نور احمد چشتی سے ہے گو دودھیال سے ان کا تعلق مخدوموں سے ہے لیکن ڈاکٹر اجمل کی مکمل تربیت اپنے ننھیال ہی میں ہوئی ہے۔ ان پر چشتی خانوادے کا اثر کہیں زیادہ ہے۔

اسی طرح سے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی بھی ہمارے ہمسائے تھے اور مشہور رسالہ کارواں اسی محلے سے نکلا کرتا تھا۔ اس کے اس "کارواں" نے اس برصغیر کی ادبی تاریخ میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور غالباً اس سے پہلے نہ اب تک اس پائے کا کوئی پرچہ نکلا ہے یہ علم و ادب کا ایک خزینہ تھا اور اسی پرچے نے ڈاکٹر تاثیر، مجید ملک، امتیاز علی تاج اور فیض احمد فیض وغیرہ کو دنیائے ادب کی نامور شخصیتیں بنایا۔ اس کا ایک پرچہ مجید ملک کی ادارت میں نکلا تھا اور

اسی میں مجید ملک کی وہ معرکتہ الآرا نظم - ع

نہیں نہیں اے حسینۂ نازنین

چھپی تھی۔ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نظم کسی انگریز شاعر کی نظم کا ترجمہ ہے۔ تقریباً دس سال بعد انور خاں نے یہ بت شکنی کی مہم شروع کی تھی۔

اسی محلہ چابک سواراں کے اندر اپنے مکان ہی میں عبدالرحمٰن چغتائی نے ایک چھوٹا سا پریس لگا کر مرقع چغتائی کا بہت سا کام مکمل کیا تھا۔

پھر اسی محلہ میں مَیں نے نسوانی دنیا کے نام سے ماہوار رسالہ نکالا جو دو تین برس تک جاری رہا۔ اُردو میں یہ پہلا اور غالباً آخری خواتین کا رسالہ تھا جس میں سیاست کی چاشنی تھی اور عورتوں اور مردوں کے اہم مضامین ہوا کرتے تھے اسی کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور سروجنی نائیڈو جیسی شخصیتوں نے اس رسالے کو خراج تحسین پیش کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے تو جامعہ ملیہ کی جوبلی کے سلسلہ میں چھپنے والے مضمون کے بارے میں ایک وضاحتی خط بھی رقم کیا جو اس رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اور جب ۱۹۴۷ء کے اوائل میں مسلم لیگ نے یونینسٹ وزارت کے خلاف تحریک شروع کی اور اس میں لاہور کی مسلمان خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا تو اس کے بارے میں اس رسالے میں تفصیلی روئیدادیں شائع ہوتیں۔ ان روئیدادوں کی بنیاد پر بمبئی کے مشہور روزنامہ بمبئے کرانیکل BOMBAY CHRONICLE میں خواجہ احمد عباس نے اپنے مخصوص کالم جو کہ LAST PAGE کے عنوان سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا میں اس رسالے کو اور اس کی مدیرہ عائشہ صدیقہ کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

اسی محلہ چابک سواراں سے مجید اکملی نے ماہنامہ نرگس نکالا جو ادب اور آرٹ کے امتزاج کا ایک قسم کا پہلا ماہنامہ تھا۔

غرضیکہ محلہ چابک سواراں کی ادبی روایات کے ساتھ صحافیانہ روایات بھی رہی ہیں۔ "مسلم اوٹ لک" کے مالک مولانا عبدالحق اور پرنٹر و پبلشر بھی یہیں اسی میں رہتے تھے اور جب راجپال ایجی ٹیشن کے زمانے میں مولانا عبدالحق اور ان کے لڑکے مولانا نورالحق اور ان کے عزیز دلاور علی شاہ

کو قید کی سزا ہوئی تھی تو ان کی قید سے واپسی کا زمانہ مجھے اب تک یاد ہے۔

میرا بچپن بے حد ہی گھٹے ہوئے ماحول میں گزرا۔ اس گھٹن نے مجھے مدتوں کئی قسم کے کمتری کے احساسات میں مبتلا رکھا۔ اس گھٹن میں ضرورت سے زیادہ دیکھ بھال، تحفظ کے شدید احساس اور لاڈ پیار نے بھی ایک خاص رول ادا کیا۔ مثال کے طور پر یہ اہتمام کیا جاتا کہ میں گھر سے باہر OUTDOOR کسی کھیل میں حصہ نہ لوں۔ کیونکہ والدین، دادا، دادی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے تھے مجھے چشم بد سے بچانے کے لیے میری ٹھوڑی اور ماتھے پر توے کی کالک لگا دی جاتی۔ ان تمام باتوں نے مجھ میں ایک قسم کی علیحدگی ISOLATION کا احساس پیدا کر دیا۔ میں گلی کے لڑکوں سے کھیلتا ضرور لیکن والدین اس کو سخت ناپسند کرتے۔ میں اگر ضد کرتا یا کوئی شرارت کرتا تو مجھے "ڈائن بن کر" ڈرایا جاتا یعنی میری ماں یا کوئی اور فرد منہ پر ڈائن کا نقلی چہرہ چڑھا، کمبل اوڑھے سامنے آجاتا میں اس کو ڈائن سمجھ لیتا اور چیخنے لگ جاتا یہ عمل مجھے سخت مضمحل کر دیتا۔ ان تمام باتوں نے مجھے والدین پر زیادہ سے زیادہ تکیہ کرنے پر مجبور کر دیا میری ماں خود بہت آرام پسند اور نفاستِ طبع کی مالک تھی اس کے لیے ہر وقت میری دیکھ بھال ایک وبال تھا چنانچہ میری دیکھ بھال کا پورا فریضہ دادی کے سپرد تھا یہی وجہ تھی کہ مرتے دم تک میری دادی سے زیادہ قربت اور لگاؤ ATTACHMENT رہی اور یہ بات میری ماں کو کھٹکتی رہی اور بہو ساس کے تعلقات کی خرابی میں ایک وجہ نزاع یہ بھی رہی۔

میرے کپڑے سینا، مجھے نہلانا، ناخن کاٹنا اور جمعہ کے لیے تیار کرنا یہ سب کام میری ماں کیا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ قمیض یا کرتہ جو بھی سیتی اس کی جیب سینے پر رکھتی دونوں "عزیزوں" کے ساتھ جیب رکھنے کا اسے ڈھنگ ہی نہ آتا تھا لیکن جب میں اس جیب کے لیے کہتا تو میری ماں کہہ دیتی کہ شریف لڑکے یہاں جیب نہیں رکھا کرتے چنانچہ مدتوں بعد تک بڑے ہو کر بھی یہ سمجھتا رہا کہ اس قسم کی جیبوں والے کرتے لچے لفنگے لوگ پہنتے ہیں۔ اسی طرح میرے ناخن ماں خود بنایا کرتی تھی چنانچہ حجام سے ناخن کٹوانے کو بھی معیوب سمجھنے لگ گیا۔

چنانچہ اسی تربیت کا یہ عالم تھا کہ میں نے آج تک کسی پیر کا مزار نہیں دیکھا ایک دفعہ بچپن

ہیں مجھے وزیر خاں کی مسجد کے پاس کوئی مزار ہے وہاں کوئی ملازم لے گیا تو بعد میں اس کی پٹائی ہوئی چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک میں نے حضرت علی ہجویری جس کو عرف عام میں داتا گنج بخش کہتے ہیں کا مزار تک نہیں دیکھا ادھر سے ہزاروں بار گزرا ہوں لیکن اندر نہیں گیا۔ میرے ماحول نے میرے ذہن میں یہ خیال بٹھا دیا کہ مزاروں پہ جانا شرک ہے۔ چنانچہ اب تک میں حضرت علی ہجویری کو داتا گنج بخش لکھنے یا کہنے سے سخت گریز کرتا ہوں۔ میری تربیت میں خدا کی وحدانیت پر شدید اصرار رہا ہے۔

ہاں بچپن کی تربیت کی سختی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پتنگ اڑانے تک کو سخت معیوب سمجھا جاتا۔ ڈور لگوانا۔ پتنگ۔ بازار سے خریدنا یہ سب کام اوباشوں اور لفنگوں کے کھاتے میں ڈال دیے جاتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ پتنگ بازی ہو یا گلی ڈنڈا کرکٹ ہو یا ہاکی کوئی کھیل بھی کھُل کر نہ کھیل سکا۔ پتنگ بازی تھوڑی بہت کی لیکن مہارت اس میں بھی حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے کہ ہمیشہ اس کھیل میں بھی ایک جرم کا احساس ستاتا رہا۔ میں میٹرک تک نمازیں اکثر و بیشتر باقاعدگی سے پڑھتا رہا۔ سورۃ یٰسین صبح کو پڑھتا اور رات کو سوتے وقت آیۃ الکرسی کا ورد کرتا۔

میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور بارھویں سال میں تھا کہ فروری ۱۹۳۲ء میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ یہ عید کا دن تھا ان کو APPENDIX ہوا تھا۔ اس کا آپریشن ڈاکٹر گنیش داس نے کیا۔ اس کا کلینک نسبت روڈ پر جہاں اب ڈاکٹر وود کا کلینک ہے ہوتا تھا اور اس نے مریضوں کے لیے تین چار کمروں کا ہسپتال بنایا ہوا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بہت مشہور سرجن تھا۔ ویانا سے وہ تعلیم حاصل کر کے آیا ہوا تھا۔ اب تو APPENDIX کا آپریشن دو دن کی مار ہے۔ لیکن اس زمانے میں ابھی سرجری نے اتنی ترقی نہیں کی ہو گی۔ بہر حال وہ آپریشن کے بعد دس دن ہسپتال میں رہے اور وہیں ڈاکٹر گنیش کے ہسپتال میں عید کی رات کو بارہ بجے جبکہ صبح دنیا عید منانے والی تھی انتقال کر گئے۔ اس جوانمرگی نے کہرام مچا دیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے بعد گیارہ بجے قبل دوپہر ان کو دفنایا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ دہلی دروازہ کے باہر باغ میں نماز جنازہ ادا کرنی پڑی اور آبائی قبرستان واقع بی بی پاک دامن میں دفنایا گیا۔

یہ مدت میری زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ باپ کا مرنا ہمیشہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے اور اگر والد کا سایہ بچپن میں اٹھ جائے تو اور بھی پریشانی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اس سلسلہ میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ دادا، دادی بقید حیات تھے۔ انھوں نے میری والدہ اور ہم دونوں کی پوری پوری نگہداشت کی۔ لیکن یہ مدت ایک اور طرح سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ جو تربیت میں سختی اور تشدد تھا۔ وہ یکدم ہٹ گیا۔ اور دادا دادی خود اتنے رقیق القلب ہو گئے کہ انھوں نے بے پناہ لاڈ و پیار شروع کر دیا۔ چنانچہ والد کی وفات کے بعد ہی میں نے چھٹی جماعت شیرانوالہ سکول سے پاس کی اور اس کے بعد ساتویں جماعت میں مشن سکول میں داخلہ لے لیا۔ کیونکہ یہ گھر کے نزدیک تھا اور والدین زیادہ دور نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ میں مشن سکول میں ایک سال ہی پڑھا۔ اسی ایک سال کے دوران اجمل سے دوستی ہوئی۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیانی سالوں میں کئی ایک سیاسی ہنگامے ہوئے جن کی دھندلی یادیں اب تک محفوظ ہیں ۱۹۲۹ء میں میری عمر ۹ سال تھی لیکن کل ہند کانگرس کے دریائے راوی کے کنارے جلسہ کی بہت ہی دھندلی یادیں ہیں۔ میرے والد جلسوں کے کافی رسیا تھے اور وہ مجھے ساتھ لے جاتے۔

یہ سال ویسے بھی بہت ہنگامہ پرور تھے۔ نوجوان بھارت سبھا کی سرگرمیاں، بھگت سنگھ کی گرفتاری اور پھر بھوک ہڑتال، داس کی موت، بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا پھانسی پر چڑھنا۔ مغل پورہ ایجی ٹیشن، علم الدین شہید، چھپن فیصدی، مجلس احرار کا قیام، ڈاکٹر انصاری کی آمد، خلافت کمیٹی کا اجلاس۔ محمد علی، شوکت علی کے ساتھ بیٹھنا۔ ان تمام واقعات وحادثات نے میرے شعور پر کافی گہرے اثرات مرتب کیے اور یہی وہ دور تھا جو خطابت کا دور کہلاتا ہے اس دور نے عظیم المرتبت خطیب پیدا کیے جنھوں نے ایک عالم کو سالہا سال تک مبہوت کیے رکھا اور میں بھی اسی عالم کا ایک حقیر حصہ تھا جو خطابت کے ان گہرے نقوش کو اپنے سینے پر ثبت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ ان تقریروں کی کشش مجھے جلسوں میں لے جاتی۔

یہ اسکول کی نویں دسویں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں مختار اور صدیق میری جماعت میں تھے ان سے میرے بڑے گہرے مراسم ہو گئے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اور ان کے اشعار پڑھنے کے انداز کا بہت چرچا تھا اور صدیق اس انداز کی بہت اچھی نقل اتارا کرتے تھے اس طرح ہم تینوں دوست موری اور لوہاری دروازہ کے باغ میں صدیق سے شاہنامہ سنتے اور احرار کے لیڈروں کی تقریروں کے اسی انداز میں چربے اتارنے کی کوشش کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجلس احرار کے یہ تمام لیڈر جوان تھے اور میدان خطابت کے لاثانی شاہسوار ایک ایک کی تقریر جادو جگاتی تھی۔ غرضیکہ مجلس احرار کی خطابت نے مجھے بہت ہی متاثر کیا اور میں جلسوں میں شرکت کا شوقین بن گیا۔ اس شوق کا اندازہ ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ سے ہوتا ہے۔ میرا گلہ خراب تھا۔ ڈاکٹروں نے TOOSIL کٹوانے کی ہدایت کی چنانچہ ہسپتال میں داخل ہو گیا اور آپریشن کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن آپریشن کا دن وہی تھا جس دن مجلس احرار کی قادیان کانفرنس قادیاں میں ہونے والی تھی۔ چنانچہ میں آپریشن کے بغیر ہی ہسپتال سے بھاگ نکلا اور رفیق وغیرہ کے ساتھ قادیاں جا پہنچا۔ یہ وہ کانفرنس تھی جس نے تہلکہ مچا دیا تھا اور یہیں سے میری مجلس احرار سے عملی ہمدردیاں شروع ہوئی تھیں۔ جو کم و بیش آٹھ نو برس تک قائم رہیں۔

ہمارے زمانے میں جب کوئی خطابت سے متاثر ہوتا تھا تو اس کا لازمی مطلب یہ تھا کہ ادب کا اسے ذوق ہے۔ وہ شعر سمجھ لیتا ہے۔ الفاظ کی بندشوں پر سر دھن سکتا ہے۔ اس دور کی خطابت میں الفاظ و تراکیب اس طرح استعمال ہوتے تھے جیسے شعر کہا جا رہا ہو! اور صرف یہی نہیں بلکہ خطیب بات بات پر شعر سناتا، گاتا، قرأت کرتا۔ غرضیکہ وہ تماشائیوں کو پوری طرح مسحور رکھتا تھا۔ یہ خطیب جادو جگانا جانتے تھے۔ اور پوری پوری رات مجمع کو بٹھائے رکھتے تھے اور یہ جادو نہیں تھا تو اور کیا تھا کہ پوری رات مجمع کو مسجد میں روکے رہو اور صبح ان مبہوت انسانوں کو سول نافرمانی کے لیے لے چلو۔ غرضیکہ یہ دور خطابت تھا اور اس کے اپنے اسلوب تھے۔ یہ وہی تھیٹر کا دور تھا جس نسل نے ابوالکلام کو سنا ہو وہ چھوٹے موٹے مقرر کو پلے ہی

نہیں باندھ سکتی۔

لطف یہ ہے کہ ہندوؤں میں اس قسم کی خطابت مقبول نہیں ہوئی بلکہ ان کے ہاں چند مقرروں نے نام پیدا کیا۔ وہ سیاست کے میدان میں ویسے بھی نامور تھے۔ ان کی تقریروں الفاظ کی بندش وتراکیب پر سر دھننے نہیں آتے تھے بلکہ سیاست سمجھنے اور اس سیاست سے متاثر ہونے کے لیے آتے تھے۔ لیکن عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کی قبیل کے خطیب سیاست سے زیادہ اپنی خطابت کا لوہا منواتے تھے۔

مجلسِ احرار سے عملاً وابستگی کی کوئی تاریخ تو متعین نہیں کی جاسکتی اس لیے کہ اس زمانے میں کانگرس کے علاوہ شاذ ہی کسی جماعت کی باقاعدہ رکنیت اور انتخابات وغیرہ ہوا کرتے تھے کسی جماعت کا حامی ہونے کا مطلب اہم مسائل پر اس جماعت کی ہمنوائی اور بوقت ضرورت دامے درمے مدد کرنا ہوتا۔

والد کے مرنے کے بعد پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی اور نہ ہی دادا کو شروع میں زیادہ خیال ہوا۔ اس لیے کہ وہ بذات خود اتنے غمزدہ تھے کہ زندگی ان کے لیے وبال تھی لیکن تھے وہ باہمت۔ انھوں نے نہایت ہمت اور بہادری سے یہ غم نہ صرف برداشت کیا بلکہ اس غم نے جو مسائل پیدا کر دیے تھے ان کو سلجھانے میں انھوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی سب سے بڑا مسئلہ تو دادا، دادی اور والد کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے وارثوں کا تھا اور پھر ہم نابالغوں کے لیے گارڈین کا تقرر اور تیسرے کرایہ داروں کے خلاف مقدمات۔ مجھے میٹرک تک تو ان جھمیلوں کا علم ہی نہ ہو سکا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں، امی جی اور عبدالرؤف بمبئی سیر کے لیے چلے گئے بمبئی میں میری والدہ کے ماموں محمد حسن ہوا کرتے تھے وہ زمانے کے ستائے ہوئے تھے لیکن تھے بہت ہی شاہ خرچ۔ انھوں نے اچھے دنوں میں بھی خوب کھایا پیا اور جب قلاش ہوگئے تو پنجاب ہی کو خیرباد کہہ دیا اور بمبئی چلے گئے۔ وہاں وہ پنجابیوں کی نمائندگی کرتے تھے یعنی اسٹیشن سے مسافروں کو گھیر کر اس ہوٹل میں لاتے ان کو اس پر کمیشن اور کچھ مقررہ تنخواہ ملتی ان کی اولاد کوئی نہ تھی صرف میاں بیوی تھے اور میری ماں سے ان کو بہت پیار تھا۔ ویسے عمر

میں بھی کوئی زیادہ فرق نہ تھا اور چونکہ میری ماں اور یہ ماموں ایک ہی گھر میں پلے تھے اس لیے وہ ایک دوسرے سے بہت ہی مانوس تھے بمبئی میں ہم تقریباً دو تین ہفتے رہے پہلے ہم باندرہ رہے پھر اس کے بعد ہم نے سنٹرل بمبئی میں بھنڈی بازار میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اس میں اٹھ آئے۔ ماموں نے خوب سیر کرائی۔ اس کے علاوہ وہاں ماموں کے ایک سالے بھی انہی کے پاس رہتے تھے۔ وہ امرتسر سے فلموں کے چکر میں آئے ہوتے تھے اور فلموں اور ایکٹر، ایکٹرسوں سے خوب واقف تھے چنانچہ ہم نے سٹوڈیو وغیرہ بھی دیکھے اور اس وقت جن ایکٹرسوں مثلاً سلوچنا، گوہر وغیرہ کو بھی دیکھا بلکہ ملاقات بھی ہوتی

اسی بمبئی کے قیام میں مجھے اُردو کے کلاسیکی ادب کے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ہماری بلڈنگ کے نیچے ایک کتابوں کی دکان تھی جہاں سے کرایہ پر کتابیں ملتی تھیں چنانچہ میں نے داستانِ امیر حمزہ، فسانۂ آزاد وغیرہ اسی زمانے میں وقت کٹی کے لیے پڑھ ڈالے۔ اس زمانے میں ادبی شعور اتنا نہیں تھا کہ ان داستانوں کی اہمیت سمجھ سکتا بہرحال پڑھ ڈالیں۔

گورنمنٹ کالج میں ہمارے زمانے میں داخلہ مشکل بھی تھا اور آسان بھی۔ میری سیکنڈ ڈویژن تھی چنانچہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے لیے انٹرویو ہوتا تھا۔ اس میں پرنسپل کے علاوہ ایک فلاسفی کے استاد ہوتے تھے ملک احمد حسن وہ غالباً سیالکوٹ کے ککے زئی تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ دادا جان مجھے ساتھ لے کر ملک احمد حسن کے گھر پر گئے تھے۔ وہ اس زمانے میں مزنگ میں کسی چوبارے پر رہتے تھے چنانچہ انٹرویو سے پہلے ان کے ہاں جانے کا فائدہ ہوا کہ مجھے گورنمنٹ کالج میں داخلہ مل گیا اس وقت تک شلوار قمیص اور چھوٹا کوٹ پہنتا تھا اور اسی سے میں نے انٹرویو دیا۔ کالج میں میرے ہم جماعت ذوالفقار، اجمل وغیرہ تھے۔

گورنمنٹ کالج کا یہ زمانہ خاصے جوبن کا زمانہ تھا۔ گیرٹ پرنسپل تھے۔ میرا گروپ ٹیوٹر جارج مٹھیائی تھا۔ فلسفہ ہمیں ملک احمد حسن پڑھاتے، نفسیات قاضی اسلم پڑھاتے۔ انگریزی کے استاد اعوان اور واسطی اور ہریش چندر تھے، تاریخ گوپال داس پڑھاتے، فارسی صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور قاضی

سے پڑھتے۔ اُردو مولوی کریم بخش سے پڑھتے۔

مسلمانوں کے لیے اس کالج میں ۴۰ فیصدی نشستیں چونکہ لازمی تھیں اس لیے مسلم طلباء سیکنڈ ڈویژن بھی لے لیے جاتے۔

کالج کا پہلا سال وہی شلوار قمیض میں گزرا۔ سال کے آخر میں پہلی بار سفید زین کی پتلون اور چیک ٹھنڈا کوٹ سلوایا اور پہنا تو مجھے اب تک یاد ہے کہ دادا مرحوم نے تھپڑ رسید کیا کہ میں عیسائی ہوگیا ہوں۔ کیونکہ یہ تصور اس وقت عام تھا بلکہ مذہب کا ایک حصہ تصور ہوتا تھا کہ جس قوم کا لباس پہنوگے قیامت کے دن اسی کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے۔ لیکن پھر دادا مرحوم آہستہ آہستہ اس لباس کے عادی ہو گئے اور چشم پوشی فرمانے لگے اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ میں کالج کے بہترین ملبوس طلباء میں شمار ہونے لگا۔ لباس کے بارے میں مجھے نفاست کا ہمیشہ خیال رہا ہے اور یہ نفاست مجھے اپنی ماں سے ملی ہے۔ مرحومہ بھی کپڑے کے معاملے میں بہت نفاست پسند اور سلیقے والی خاتون تھیں۔

ادب سے میری دلچسپی سیاست سے بھی قدرے پہلے شروع ہوئی۔ اس دلچسپی کی سب سے اہم وجہ ناول ہے۔ کیونکہ گھر سے باہر نکلنے اور بیرونی کھیلوں پر پابندی نے مجھے بہت حد تک INTROVERT بننے مجبور کر دیا۔ میرے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور کھیل اپنے مکان کے سامنے تک تھی۔ انہی حدود کے اندر میں والد کے دفتر سے آنے سے پہلے جو بھی کھیل کھیل سکتا تھا۔ کھیلتا تھا اس میں گلی ڈنڈا، گیند بلا، اور بنٹے سبھی شامل تھے لیکن اس کے ساتھ ہی گھر پر وقت گزارنے کے لیے ناولوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہمارے محلے میں ایک پرائمری ٹیچر، ماسٹر جان محمد ہوتا تھا۔ اس کو ناول پڑھنے کی لت تھی اور اس کی اگر کوئی HOBBY تھی تو یہی کہ ناول خریدنا اور پڑھنا۔ وہ ہم کو بھی ناول پڑھنے کے لیے دیتا۔ ماسٹر جان ہی سے میں نے عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، صادق وغیرہ کے ناول لے کر پڑھے۔ ان ناولوں سے انگریز اور عیسائی دشمنی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت نے غلامی کے خلاف لڑنے پر اکسایا۔ یہ ناول دراصل اسی شعور

کے ابھار کے لیے تو وجود میں آتے تھے ماسٹر جان سے ہی میں نے جاسوسی کے ناول لے کر پڑھے ان میں بہرام ڈاکو کے کارناموں سے لے کر تیرتھ فیروز پوری کے تمام ناول تھے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا کہ جاسوسی ناولوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اور شیخ اختر نے جو میرے محلہ دار تھے مل کر ایک جاسوسی ناول لکھنا شروع کیا۔ اس کا نام 'لال تھڑا' رکھا تھا۔ خیر یہ ناول کیا لکھنا تھا لیکن اس سے لکھنے اور پڑھنے کی لت ضرور پڑ گئی۔ لیکن ادب سے دلچسپی کی کچھ اور بھی وجوہات تھیں اولاً ہمارے مکان کے بالکل سامنے مشہور پنجابی شاعر ہدایت اللہ کا مکان تھا اور میں نے اپنے بچپن میں ہدایت اللہ کو دیکھا ہے اس زمانے میں وہ مخبوط الحواس ہو گئے تھے اور وہ شام کو جب اپنے تھڑے پر باہر نکلتے تو بچے اسے تنگ کرتے اور وہ اپنی ڈانگ سے ان کو پیٹنے کی کوشش کرتے۔

ہدایت اللہ کی سی حرفی میری ماں اور دادی پڑھا کرتی تھیں اس سے بھی پڑھنے لکھنے کی عظمت کا احساس ہوا۔

میری زندگی میں سیاست اور سیاست سے دلچسپی ویسے تو دبے پاؤں آئی لیکن بالآخر جب میں نے سیاست میں کھلم کھلا دلچسپی کا اظہار شروع کیا تو اس کی پشت پر اقتصادی بحران تھا۔ جب میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا اور گورنمنٹ کالج کے اثرات نے کھل کھیلنا شروع کیا تو اس کا ردعمل سیاست سے دلچسپی کی صورت میں نکلا۔ گورنمنٹ کالج کی زندگی اور میری گھریلو زندگی میں زبردست تضاد تھا۔ گورنمنٹ کالج میں امارت، موٹر، بہترین لباس، مغرب زدگی، ریستوران گردی۔ یہ زندگی تھی، فلم، لڑکی، شراب، روزمرہ کا معمول تھا۔ اس زندگی میں جو دوست بنے وہ بھی گو میرے طبقے ہی سے متعلق تھے اور وہ بھی کم و بیش انہی تضادات کا شکار تھے لیکن وہ ان تضادات سے کچھ دنوں نبھاہ کرنے کی سکت رکھتے تھے یا ان کے لیے کوئی دوسری راہ نہیں کھلی تھی یا پھر وہ ان تضادات کو مقابلے کے امتحان COMPETITION میں بیٹھ کر اور اچھی نوکری کے خواب دیکھ کر حل کرنا چاہتے تھے لیکن میں پڑھائی کا بھی کوئی بہت زیادہ شوقین نہیں تھا اور گورنمنٹ کالج میں جب داخل ہوا تو اس وقت میری زندگی پر سیاست کی چھاپ کافی گہری ہو چکی تھی۔ اب گورنمنٹ کالج نے کچھ دنوں کے بعد اس راہ سے ہٹانے کی کوشش کی اس لیے کہ گورنمنٹ کالج میں میری دوستی جس گروہ سے ہوتی وہ سب لباس اور امیرانہ

ٹھاٹھ باٹھ کے خوابوں میں مست زندگی گزار رہے تھے اور سیاست ایک گھٹیا عمل تصور ہوتا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب سیاست کی یلغار گورنمنٹ کالج کو بری طرح متاثر کر رہی تھی یہی وہ سال تھے جب پہلی بار گورنمنٹ کالج میں سٹوڈنٹس یونین کا انتخاب سٹوڈنٹس فیڈریشن جو کمیونسٹ طلبا کی جماعت تصور ہوتی تھی کے نمائندوں کی طرف سے لڑے جانے کا فیصلہ ہوا اور راج ہنس کرشن جو حکومت پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل بسنت کرشن کا لڑکا تھا سیکرٹری کے عہدہ کے لیے کھڑا ہوا وہ بہت اچھا مقرر تھا اور کھدر پوش تھا۔ پہلی بار کھدر کا لباس گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا لیکن الیکشن سے پہلے ہی ایجی ٹیشن کے الزام میں راج ہنس کو کالج سے نکال دیا گیا اس پر زبردست ہنگامہ ہو گیا اور سٹوڈنٹس فیڈریشن نے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ذوالفقار بخاری جس کو ہم زلفی کہا کرتے تھے کو اپنا امیدوار بنا دیا۔ زلفی کو سیاست سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی وہ سخت قسم کا اوباش تھا جسے بننے اور اپنے کو ہر وہ چیز ظاہر POSE کرنے کی عادت تھی جو وہ نہیں تھا۔ لیکن وہ بھاری اکثریت سے منتخب ہو گیا۔ گورنمنٹ کالج کی زندگی میں پہلی بار سیاست غالب آ گئی۔

یہ سوانح آج جب لکھ رہا ہوں اور بیتے ہوئے دنوں کی روئیداد قلم بند کرتا ہوں تو بہت ساری حقیقتیں جو کل ایک عظیم حقیقت کے طور پر میری سوجھ بوجھ، میرے وجدان، میری فکر، اور میرے شعور کا ایک لافانی حصہ بنی ہوئی تھیں۔ جن حقیقتوں کے لیے میں کٹ مرنے کے لیے تیار ہوتا تھا اور جن حقیقتوں کے بارے میں میرا نظریہ یہ تھا کہ ان کو اسی طرح دیکھا جائے اور سمجھا جائے جس طرح میں سمجھا کرتا تھا۔ لیکن آج میں ان حقیقتوں کو سچا تو ضرور تصور کرتا ہوں۔ لیکن اُن کے متعلق میری نظر اور سوجھ بوجھ میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب ان حقیقتوں کو جھٹلانے والے کو بھی میں جھوٹا اور دغاباز نہیں کہتا اور نہیں سمجھتا۔ اب میرے نزدیک سچائی اور حقیقت تک پہنچنے کی ایک راہ نہیں کئی راہیں ہیں اور ہر راہ کا راہی عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔

مجھے اس وقت ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں امجد نے ''غسل خانے'' والا مضمون لکھا اس میں کمیونسٹوں

پر ہلکی پھلکی طنز تھی میں اس طنز پر بھی بگڑ گیا اور ایک عرصہ تک اس سے کھنچا کھنچا رہا۔ حالانکہ یہ لوگ اپنی عدم COMMITMENT کے باوجود دردِ دل رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کو سیاست سے ایک گونہ دلچسپی تھی۔ آگے نہیں۔ ان کو اپنے معیار پر پرکھنا ایسے ہی غلط تھا جیسے وہ مجھے اپنے معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے تو میں پاگل نظر آتا ہوں گا۔

یہ دور بھی جنوں خیزیوں کا دور تھا۔ یہ عشق کا دور تھا۔ محرومیوں کا انتقام لینے کا دور تھا۔ میں نے اپنی زندگی تمام خواہشوں، تمناؤں، امیدوں اور خوابوں کو کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ یہ بلوغت تک پہنچنے کا عبوری دور تھا۔ اس میں بھی وہی دیوانگی تھی جو بچپن میں نمازوں کے دوران ہوتی تھی جو رقت اور گریہ زاری اس دور میں ہوتی تھی وہ آج نازیوں کے ظلم پڑھ کر طاری ہو جاتی۔ سرخ فوج کی بہادری اپنے اندر نیا ولولہ پیدا کر دیتی۔ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر عقل و فہم کے مظہر، دیانت و سچائی کے پیکر، بہادری و جوانمردی کے مجسمے نظر آتے۔ ان کی لیاقت اور ان کے فکر کی قسم کھانے کو جی چاہتا۔ یہ وہ دور تھا جب اس برصغیر کے کمیونسٹ جوشی کی شخصیت سازی میں پوری طرح مصروف تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سٹالن عظیم باپ بن کر پوری کمیونسٹ دنیا پر چھایا ہوا تھا اور اس عظیم باپ کے سائے میں ہر ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری یا چیئرمین کو اسی نوع کی اہمیت دی جا رہی تھی۔ ویسے یہ وہ دور تھا جس میں ابھی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے بانی لیڈر موجود تھے اس لیے یہ لوگ خود اپنی بزرگی، اپنے تسلسل، اپنی استواری اور اپنی قربانیوں کی بنا پر بھی کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں میں خاصے مقبول تھے۔ یہ دور تھا ہیری پولٹ کا، مارلیس تھورینر کا، ڈمیٹروف کا۔ اس دور میں ماؤ اور ہوچی منہ کمیونسٹ دنیا کے لیڈروں میں سے لیڈر تھے وہ کوئی مرکزی شخصیت نہ تھے۔ اس دور میں یورپی کمیونسٹ ماؤ سے بھی زیادہ متاثر کرتے تھے۔ ماؤ کی تحریریں بھی کوئی زیادہ متاثر نہ کرتی تھیں۔ ہمیں سب سے زیادہ متاثر برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما کرتے تھے بالخصوص پام دت۔ کیونکہ ہندوستان کی سیاست کے بارے میں برطانوی کمیونسٹ لیڈروں میں وہی سب سے زیادہ لکھتا اور یہ اس کا مخصوص مضمون PET SUBJECT تھا۔ ویسے بھی وہ مشہور ہندوستانی ماہر اقتصادیات کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے انیسوی صدی

کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی اقتصادی حالت کے بارے میں بہت ہی اہم کتابیں لکھی ہیں۔

میں کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن ایک طرح سے اسی دن بن گیا تھا جس دن دادا مرحوم کی وفات ہوئی۔ وفات کی تاریخ ۶ مارچ ۱۹۴۲ء ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ لیڈر اور کارکن دیولی کیمپ سے رہا ہو رہے تھے کیونکہ انھوں نے اندر سے ہی پارٹی کی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ سوویٹ یونین کی جنگ میں شرکت سے جنگ کا چلن بدل گیا ہے اور اب یہ جنگ سامراجی جنگ نہیں رہی بلکہ عوامی جنگ ہوگئی ہے اور اب اس جنگ میں عوام کو متحد ہو کر حصہ لینا چاہیے اس اتحاد سے اور جنگ میں شرکت سے سامراج کمزور ہوگا۔ اور عوامی محاذ زیادہ مضبوط ہوگا۔

کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ۱۱۴ میکلوڈ روڈ پر جمع ہونے لگے۔ یہ ۱۱۴ میکلوڈ روڈ چار پانچ کمیونسٹ طالب علموں نے مل کر کرائے پر لی ہوئی تھی۔ او ہم ویسے پہلے بھی یہاں آتے جاتے تھے۔ ان میں ستبرت بیدی اور ایک مونا سکھ سلطان سنگھ، بردی تھے۔ ست برت اس زمانے میں PSYCHOLOGY کا ایم اے کر چکا تھا یا کر رہا تھا اسی طرح بردی بھی اکنامکس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

سلطان سنگھ بردی کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا اور وہ تنظیم سے متعلق تھا۔ اور یہ دراصل خفیہ تنظیم ہی کا اڈہ تھا۔ چنانچہ جب کمیونسٹ لیڈر رہا ہوتے تو یہ اڈہ ہی ان کا سرکاری مرکز بنا اور یہیں پر پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر قائم ہوا۔ بہرحال کمیونسٹ پارٹی سے متعلق ہونے اس کی رکنیت اختیار کرنے کی کہانی خاصی طویل ہے۔ ویسے میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف تو ۱۹۳۸ء سے کھنچنا شروع ہو گیا تھا اور فضل الٰہی قربان اور فیروزالدین منصور سے دوستی سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ فضل الٰہی قربان تو میرے بادا کے بہت گہرے بچپن کے دوست تھے۔ فیروزالدین منصور سے عرب ہوٹل میں واقفیت ہوئی جو بعد میں خاصی دوستی اور عقیدت میں بدل گئی اور جب پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور تمام کمیونسٹ لیڈر گرفتار کر لیے گئے تو خفیہ تنظیم سرگرم عمل رہی۔ اس خفیہ تنظیم سے میرا رابطہ ہوا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس رابطے کی بھی ایک دلچسپ

داستان ہے۔

۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء تک میں اگرچہ ایک قدرے سوشلزم سے متاثر تھا۔ لیکن تاثر بہت کچا پکا تھا۔ کوئی گہرا علم نہ تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سوشلزم سے متعلق کتابیں حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بہر حال جتنی کتابیں اور پمفلٹ مجھے مل سکے وہ میں نے پڑھنے شروع کیے لیکن ساتھ ہی میں مجلس احرار سے بھی خاصا متاثر تھا چنانچہ جب امرتسر میں ضمنی انتخاب ہوا اور وہاں سے چودھری افضل حق نے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تو میں بھی ان کی مہم میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچا جہاں میرے ہونے والے سسر مولوی عبدالکریم رہا کرتے تھے اسی زمانے میں ہی دوسری جنگ عظیم کے خلاف مجلس احرار نے امرتسر میں ہی ایک زبردست قرارداد منظور کی۔

حقیقت یہ ہے قانونی جماعتوں میں پہلی جماعت مجلس احرار ہی تھی جس نے اس جنگ کو سامراجی جنگ کہا اور اس کی مخالفت اور مزاحمت کا کھلے بندوں اعلان کیا اور اسی کھلی سامراج دشمنی نے مجھ ایسے نوجوانوں کو متاثر کیا ان کی جرأت و بہادری خطابت و سیاست اور دار و رسن کی ہر آزمائش پر پورا اترنے کی بے تابی نے اس زمانے میں مسلمانوں کے نچلے طبقے کو بے پناہ طور پر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ میرے خاندان کی وہابیت (اہل حدیث) اور مولانا داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی لاہوری سے قریبی تعلقات اور عقیدت نے بھی سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یہی فضا تھی جس نے میری اور شورش کاشمیری مرحوم کی دوستی کی داغ بیل ڈالی شورش شہید گنج کی تحریک کے سلسلے میں جیل سے رہا ہو کر آیا اور مجلس احرار میں شریک ہو گیا۔ اگرچہ وہ بہت ہی مختصر سے زمانے کے لیے جیل سے باہر رہا لیکن اس مختصر سے قیام میں بھی اس سے محبت اور دوستی کا رشتہ استوار ہوا میں اسکی بہادری، جرأت، تحریر و تقریر اور شاعرانہ صلاحیتوں، سبھی کا معترف تھا۔ میں نے ۱۹۳۸ء کے آخر میں "سرمایہ داری" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا۔ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ شورش نے لکھا تھا۔ شورش سے دوستی اور محبت سالہا سال چلی اور بالخصوص جتنے دنوں وہ جیل میں رہا تو میں نے اس سے ملاقات کے لیے کوئی جیل نہیں چھوڑی۔ وہ جس جیل میں تبدیل ہوتا میں اسی جیل میں اس سے ملنے کے لیے جاتا رہا

وہ ایک جیل سے دوسری جیل میں جب منتقل کیا جاتا تو خود مجھے اطلاع کرا دیتا کہ اب فلاں جیل میں جا رہا ہوں اور میں وہیں پہنچ جاتا۔ ایک جیل سے دوسری جیل تک سفر ہم اکھٹے ہی کرتے اور مسلسل خط و کتابت بھی رہتی۔

یہ ۱۹۴۰ء کے ابتدائی مہینے تھے مجھے تاریخ اور مہینہ صحیح یاد نہیں رہا لیکن سال ضرور یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ یہ ۱۹۴۰ء کا اوائل تھا۔ شورش منٹگمری جیل میں فوجی بھرتی کے خلاف تقریریں کرنے کی پاداش میں سزا کاٹنے کے لیے پہنچا تھا۔ میں اس سے ملنے منٹگمری جیل پہنچا۔ دوران ملاقات اس نے مجھے بتایا کہ ایک اور سیاسی قیدی جو اسی جیل میں ہے اور کمیونسٹ پارٹی سے متعلق ہے اور وہ تمھاری کتاب "سرمایہ داری" پڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ جیل کے افسر کی اجازت سے انھیں بلوا گیا تھوڑی دیر بعد میرے سامنے ایک ایسا سیاسی قیدی موجود تھا۔ جس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کے خدوخال اور وضع قطع نے مجھے شدید طور پر متاثر کیا۔ گورا چٹا رنگ بھورے بال، گھنی لمبی داڑھی جس کی دیکھ بھال خاص طور پر کی گئی تھی۔ بلّوری آنکھیں اور مجسمہ عیسیٰ کی مانند اگر اس قیدی کی اس زمانے کی کوئی تصویر ہوتی تو وہ بالکل حضرت عیسیٰ کی تصویر سے مشابہہ ہوتی۔

یہ میرداد تھا۔ منٹگمری جیل کے دفتر میں آدھ پون گھنٹہ وہ مصروف گفتگو رہا۔ اس کا لہجہ نہایت دھیما تھا اور محبت سے بھرپور گفتگو دل میں دبے پاؤں اترتی جا رہی تھی اس کی باتوں سے خلوص کی شیرینی ٹپک رہی تھی اور پٹھانی اردو میں اس کی بات چیت بہت ہی بھلی معلوم ہوتی اس کی تمام کشش کے باوجود یہ ایک سرسری اور سطحی ملاقات تھی۔ اور ایک سیاسی قیدی سے ملاقات۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں مارکسزم سے متاثر و مانوس ہو چکا تھا۔ اور تھوڑا بہت عملی کام بھی کر رہا تھا۔ کمیونسٹ حلقوں میں میرا اٹھنا بیٹھنا تو پہلے سے ہی تھا۔ بالخصوص فیروزالدین منصور اور فضل الٰہی قربان سے تعلقات خاصے تھے اور فضل الٰہی قربان سے تو عزیز داری بھی تھی۔ میرے والد مرحوم کے سکول کے ساتھی اور دوست تھے۔ لیکن ان چیزوں سے زیادہ میں کمیونسٹ پارٹی اور مارکسزم کی طرف ادب کے حوالے سے زیادہ راغب ہوا۔ ترقی پسندوں کی نگارشات، اور ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر محمود الظفر، ایم اے او کالج کے اساتذہ کا گروہ اور پھر فیض احمد سے تعلقات

نے کمیونسٹ پارٹی سے قریبی تعلقات استوار کرنے میں راہنمائی کی۔ میر داد کی کہانی بیان کرتے ہوئے میں یہ ذاتی باتیں اس لیے کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ میر داد کی ذات ہی تھی جس نے مجھے عملی طور پر کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔

اور یہ ۱۹۴۰ء کا سال ہی تھا۔ لیکن اب ابتدائی مہینے نہ تھے بلکہ یہ اس سال کا چل چلاؤ کا زمانہ تھا کہ ایک دن اخبارات میں قریباً تین یا چار سطری خبر شائع ہوئی کہ ایک کمیونسٹ قیدی نے جس کو لاہور سنٹرل جیل سے کہیں منتقل کیا جا رہا تھا، چلتی گاڑی سے ہتھکڑی سمیت چھلانگ لگا دی۔ قیدی کا نام میر داد تھا۔ اس خبر نے میر داد کی اہمیت کو کئی گنا بڑھا دیا۔ کیونکہ چلتی گاڑی اور وہ بھی فرنٹیئر میل جیسی تیز رفتار گاڑی سے چھلانگ لگانا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ اس ہمت اور جرأت کا مظاہرہ وہی شخص کر سکتا تھا۔ جس میں اپنے اصولوں اور آدرشوں کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو۔ وہی شخص جان ہتھیلی پر رکھ سکتا تھا۔ جس میں بے پناہ جذبے کے تحت کسی عقیدے، کسی تحریک اور کسی انقلاب کے لیے جان ہار دینے کی ہمت ہو۔ میر داد اسی قبیل سے تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنے آدرشوں کی خاطر اپنی زندگی کی بازی لگا دی۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر اس نے جیل کی اونچی اونچی دیواروں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تاکہ وہ عوام کو منظم کر سکے۔ تاکہ وہ سامراج کے خلاف ایک ابھرتی ہوئی تحریک میں شریک ہو سکیں اور اپنے ملک کو آزاد کرا کے نئی سماج کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ یہ اقدام بظاہر کتنے بھی خیالی اور کتنے بھی ہوائی کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ لیکن ان خیالوں، ان آدرشوں کے لیے کتنے لوگوں نے اپنی جان کی بازیاں لگا دیں۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یہ آدرش خیالی ہیں۔ یہ اصول ہوائی ہیں۔ یہ خواب ہیں۔ یہ ناقابل حصول ہیں۔ انھیں ان خوابوں کی تعبیر کا علم تھا۔ ان کو اپنی جدوجہد پر یقین محکم تھا کہ آج جن تصورات کو ایک عالم خیالی اور ہوائی بتاتا ہے وہ آنے والے کل کو اس روئے زمین پر متشکل ہوں گے بالکل اسی طرح جس طرح ۱۹۱۷ء میں دنیا کے چھٹے بر ایک نئی سماج کی بنیاد پڑی اور پھر اگر آج میر داد زندہ ہوتا تو وہ اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کی تعبیر کو اس روئے زمین کے کئی ممالک میں جیتا جاگتا دیکھتا۔ لیکن جب میر داد نے چلتی ٹرین

سے چھلانگ لگائی تو اس برصغیر میں وہ بہت ہی مختصر اقلیت کا فرد تھا۔ اس کے خوابوں کے لیے جدوجہد کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میر داد کو اپنے آدرش، اپنے عقیدے اور اپنے خوابوں کی سچائی پر یقین کامل حاصل تھا۔ اس کے لیے اس راہ میں زندگی ہارنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن وہ زندہ رہا۔ وہ چھلانگ لگا گیا۔ زخمی ہو گیا۔ لیکن پولیس اسے پکڑ نہ سکی اور پھر ایک اتوار کو جب میرے ہاں دوستوں کا اجتماع تھا، گپیں ہو رہی تھیں، تاش کھیلا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں اتوار بڑا ہنگامہ پرور دن ہوتا تھا۔ میرے ہاں دوست جمع تھے اور مجھے ان سے چھٹی لے کر دوپہر کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہاں جانا تھا۔ وہاں خواجہ عبدالوحید ابوالخیر محمد عبداللہ مرحوم، عبدالماجد مرحوم، شیخ غلام محی الدین مرحوم، علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم محمد شریف بینی اور اسی قبیل کے دوسرے احباب چائے نوشی کے لیے جمع ہوتے اور مختلف مسائل پر خوش گپیوں کے ساتھ علم و دانش کے خم لنڈھاتے تھے۔ مجھے بھی ان مجلسوں میں تواتر کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملتا تھا اور اتوار کو میں اپنے تاش کھیلنے والے دوستوں کو چھوڑ کر بھی ان بزرگوں کی صحبت میں شریک ہوتا۔ چنانچہ جس اتوار کا ذکر کر رہا ہوں اس اتوار کو یہ اجتماع سید عبداللہ کے ہاں تھا۔ کہ میرا ملازم مجھے وہاں بلانے کے لیے آیا کہ مدراس سے آپ کا کوئی مہمان گھر پر آیا ہے اور وہ جلد ہی آپ کو بلا رہا ہے۔ چنانچہ میں جلدی سے اپنے گھر پہنچا تو میرے دوستوں کا پورا ہجوم تاش کھیلنے میں مصروف تھا اور درمیان میں ایک شخص مدراسی پنڈت کا لباس پہنے اور ماتھے پر تلک لگائے بیٹھا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ فوراً اٹھ کے میرے قریب آ گیا جیسے وہ مجھے گلے ملنے کے لیے بے تاب ہو۔ اور اس نے مجھے گلے ملتے ہوئے میرے کان میں کہا "میر داد" اس وقت "روپ" ہوں۔

ان دو لفظوں کے بعد وہ اپنی جگہ پر آ گیا اور میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میرے اندر تلاطم بپا تھا یہ فیصلہ کن گھڑی تھی۔ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جس وادیٔ پرخطر کے دہانے پر میر داد نے مجھے لا کھڑا کیا ہے اس سے آگے بڑھتا چلا جاؤں یا پھر قدم روک لوں۔ بہر حال دوستوں کا اجتماع ختم ہوا تو میر داد سے گفتگو شروع ہوئی یہ گفتگو

رات دیر تک جاری رہی اور اس کے بعد خفیہ کمیونسٹ پارٹی کا جز وقتی سیاسی کارکن بن گیا۔

اور پھر جب کمیونسٹ لیڈر ۱۹۴۲ء کے اوائل میں رہا ہونے شروع ہوئے اور پارٹی کی سرگرمیاں قدرے قانونی سطح پر شروع ہوئیں تو میں کل وقتی کارکن بن گیا۔ سب سے پہلے میں پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار رسالے "جنگ آزادی" میں فیروزالدین منصور کے ساتھ ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایک سال کے لگ بھگ میں نے اس میں کام کیا اس سے اگلے سال مئی ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس بمبئی میں منعقد ہوئی تو اس میں مجھے بحیثیت ایک ڈیلی گیٹ کے شرکت کا موقع ملا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ اور یہیں بمبئی کے قیام کے دوران میں سجاد ظہیر جو اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے اور پارٹی کے مرکزی اخبار "قومی جنگ" کے مدیر تھے نے مجھے پنجاب پارٹی کی طرف سے "قومی جنگ" کے ادارتی عملہ میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا۔

غرضیکہ کمیونسٹ پارٹی کی سیاست میرا اوڑھنا بچھونا بن گئی اور مدتوں میں اس وادی خارزار میں چلتا رہا۔ یہ تھی میری نصف زندگی باقی نصف زندگی کی داستان پھر کبھی رقم کروں گا۔ اس دوران سیاست کی دنیا میں ہزاروں تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن کمیونزم پر میرا اعتقاد جوں کا توں ہے۔ اور یہ سطور اسی کا اعتراف ہے۔

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے
تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

جتنی داستان میں نے بیان کی ہے اس کے بھی ہزاروں گوشے ایسے ہیں جن کو میں لکھ نہیں پایا۔ کیونکہ ان اوراق کا مقصد کوئی اپنی سرگزشت یا سوانح لکھنا نہیں تھا بلکہ ان اوراق سے صرف اپنے ماضی کی نشاندہی کرنا تھی۔ تاکہ آئندہ صفحات میں حج کے روزنامچے میں جن کیفیتوں کا ذکر ہوا ہے ان کو سمجھنے میں قاری کو آسانی ہو کیونکہ سچ یہ ہے کہ میں ان اوراق کے بارے میں کچھ کہنے سے ڈرتا ہوں۔

مثلِ نے ، ہر استخواں میں درد کی آواز ہے
کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے

واقعی میں ان اوراق کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس روز نامچے کو لکھتے ہوتے چار برس ہونے کو آئے ہیں۔ میں ڈرتا رہا کہ ان کیفیات کو غلط معنی نہ پہنائے جائیں۔ اسی "خوف" نے مجھے اتنا عرصہ روکے رکھا۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کو بہر حال شائع ہونا چاہیے کیونکہ ان میں "عقل اور بے عقلی" کے عجیب و غریب ملغوبے آپ کو ملیں گے اور اسی کو حدیثِ دل کہتے ہیں۔

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

یا پھر۔

شمع کی طرح کون رو جانے
جس کے دل کو لگی ہو سو جانے

عبداللہ ملک

۲۷ر دسمبر

آج بدھ کا دن ہے اور صبح کے ساڑھے چھ بجے ہیں کراچی کا شہر ہے ابھی ابھی صبح کی اذانیں ہوئی ہیں اور میں اپنی نیند پوری کر کے اٹھ بیٹھا ہوں۔ رات کو بارہ بجے سویا تھا شروع میں سخت بے چینی تھی اور خدا سے دعائیں مانگتے ہوئے کہ یا خدا یہ بے چینی دور ہو، سکون ملے انہی دعاؤں اور "ایاک نعبد وایاک نستعین" پڑھتے ہوئے سو گیا۔ رات جیسے جیسے آنکھ کھلتی رہی یہ دعا پڑھتا رہا اور اس طرح سے رات کٹ گئی اور آج کراچی میں یہ آخری دن ہے۔ آج رات کو ساڑھے دس بجے عازم جدہ ہو جانا ہے

میری حج کے لیے روانگی ایک عالم کے لیے باعثِ حیرت بنی ہوئی ہے۔ جس نے بھی سنا حیران ہوا۔ کسی نے اس کو کمیونسٹوں کا فراڈ قرار دیا۔ کسی نے میرے مارکسزم پر اعتقاد میں کیڑے ڈالے۔ کسی نے کچھ سمجھا۔ بہر حال ہر بات کو ہنس کے ٹال دیتا رہا۔ لیکن دوستوں کو میں نے دل کی بات بتا دی وہ ابھی تک درست ہے۔ حج کے لیے جانے کا مقصد صرف عائشہ کی خوشنودی ہے۔ چونکہ عائشہ کی یہ خواہش تھی اور اس کی یہ خواہش اس وقت تک مذہب کی رُو سے

پُوری نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ خاوند ہمراہ نہ ہو۔اس لیے مجھ پر لازم تھا کہ میں اسکی خواہش پوری کرتا۔ مجھے جو اس سفر اور اس کے دوران ہونے والی تکلیفوں کا احساس بے چین کرتا ہے تو اسکو یہی خیال دور کر دیتا ہے کہ اگر عائشہ ۲۸ برس تک میرے دکھوں اور سکھوں میں مسکراہٹوں کے ساتھ اور بغیر کسی شکوہ کے شریک رہ سکتی ہے تو مجھے یہ مہینے ڈیڑھ مہینے کی تکلیفوں کے لیے حرفِ شکایت لبوں پر نہیں لانا چاہیے۔ وہ بھی تو میری ہم مسلک نہ تھی آخر اس نے نباہ کیا ہے تو میں کیوں نہ کروں۔

جہاں تک اعتقادات پر غور کرتا ہوں تو میں ایک مدت سے ان مذہبی اعتقادات سے ایک گونہ بے نیاز ہو چکا ہوا ہوں۔لیکن اس بے نیازی نے مجھے مذہبی اعتقادات اور اور عبادات کا مذاق اڑانے کی طرف کبھی مائل نہیں کیا۔بلکہ عام اجتماعات میں ان کا احترام کرتا رہا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں۔ میں تہذیبی مسلمان ہوں اور اپنے تہذیبی ورثے اور روایات کا احترام اور ان سے پیار کرتا ہوں۔ میرے ان رویّوں کی تشکیل میں کمیونسٹ پارٹی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ورنہ جب شروع میں میری سوجھ بوجھ کچی پکی تھی تو یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ادب اور علم کے افق پر فرائڈ اور مارکس کی کچی پکی تعلیمات کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں اور ان کا نام لے کر ہماری نسل بغاوت کا پرچم کھول رہی تھی یہ ۳۶ء سے ۴۷ء تک کا دور تھا تو میں بھی مذہب سے نیم باغی ہو ا تھا ۔لیکن اس زمانے میں بھی مذہبی روایات کا مذاق اڑانے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی اس کی وجہ میرے خاندان کی مذہبی روایات اور انکا مذہب سے لگاؤ تھا۔دوسرے میری تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی اور ایک عمر تک واقعی مذہب سے خاص شیفتگی رہی تیسرے میں سیاست میں مذہب کی راہ سے آیا تھا۔میری سیاست سے دلچسپی کا آغاز مولانا داؤد غزنوی کے خطبوں اور چینیانوالی مسجد میں نمازوں سے ہی ہوا تھا۔انگریز دشمنی اور غلامی کے خلاف جدوجہد کے بیج بھی اسی زمانے میں پڑے تھے اور بالآخر یہی مذہبیت اور غلامی سے نفرت کے جذبات کی مٹی سے ہی میری احرار دوستی کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔اور اسی ملغوبے نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر اکسایا۔چنانچہ جب اس

کچی پکی عمر میں اگرچہ ایک طرف اگر مارکس کی تعلیمات کا اثر ہو رہا تھا تو ساتھ ہی یہ مذہبی اثرات بھی موجود تھے چنانچہ میں جب کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا اور کل وقتی کارکن بنا تو میں احرار اور کانگریس کی راہ سے آیا تھا۔ اس لیے میں ان مسلمان کمیونسٹوں میں نہیں تھا جن کی مذہبی تربیت ہی نہیں ہوئی تھی یا اسلامی تحریکوں سے بالکل بے بہرہ تھے۔ چنانچہ پنجاب میں جب میں کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بنا تو مذہبی تربیت پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی بلکہ مارکسی تعلیمات نے اس دور کو عقلی طور پر سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں مدد دی اور اس دور کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا اور عملاً مذہبی روایات کا احترام سکھایا۔ اس احترام کی وجہ صاف تھی کہ اگر کمیونسٹ عوام کی مذاہب سے شیفتگی کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے تو اس صورت میں عوام میں ایک بے پناہ مزاحمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا جس سے عوام ان کی سیاست کی صحت پر یقین کرنے کے لیے کبھی بھی آمادہ نہ ہوتے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف کمیونسٹ مذہبی روایات کا عملاً احترام کرتے تھے تو دوسری طرف سامراج یہ مسلسل پروپیگنڈہ کر رہا تھا کہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے وہ مذہب کے دشمن ہیں وہ درست ثابت ہوتا۔ یہ درست ہے کہ مارکسزم کا فلسفہ جدلیاتی مادیت پر مبنی ہے اور وہ مذاہب کو آسمانی مذاہب نہیں مانتے اور وہ مذہبی طبقوں اور ظالم طبقوں کے گٹھ جوڑ کی نشاندہی بھی اپنی تحریروں میں کرتے رہے ہیں لیکن یہ تحریریں فلسفیانہ سطح کی ہیں عملاً وہ اپنی سیاست اور تنظیم کو عوام کے مذہبی جذبات کے خلاف صف آرا نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ صف آرائی غلط ہے اور سیاسی مقاصد میں مدد کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہے ان کے نزدیک عوام کا استحصال کرنے والے طبقوں کے خاتمے کے ساتھ مذہبی طبقوں کا استحصال بھی ختم ہو جائے گا اس لیے کمیونسٹوں کا ہمیشہ اصرار اپنی سیاست اور تنظیم پر ہوتا ہے اور وہ مذہب کے محاذ پر کبھی بھی صف آرائی نہیں کرتے۔ اور نہ ہی عام لوگوں کی روایت پرستی اور نہ ان کی مذہب سے شیفتگی سے تعرض کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے شوق عبادت پر انگلی اٹھاتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مارکس کے فلسفہ اور اصولوں پر قائم کی گئی کمیونسٹ پارٹیاں ان اصولوں کی بنیاد

پر معاشرے کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں کیونکہ مارکسزم اصل میں تو سماج کو بدلنے اور از سر نو ترتیب دینے کی ایک سائنس ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک جب سماج کا بنیادی ڈھانچہ تبدیل ہو جاتا ہے تو افکار و خیالات، عقائد و عبادات میں بھی تبدیلیاں لازمی ہو جاتی ہیں اور یہ تبدیلیاں نامعلوم طریقے سے ہونی شروع ہوتی ہیں چنانچہ اس ضمن میں سوویت روس میں بپا ہونے والے سوشلسٹ انقلاب کو اگر جانچا جائے کہ وہاں کی تہذیبی اور روحانی زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ کسی کے جبر، کسی کے تشدد سے رُوپذیر نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی دہریت کے پروپیگنڈا ہی نے کوئی اپنا جلوہ دکھایا ہے جبکہ تبدیلیاں اس وجہ سے رونما ہوئیں کہ وہاں کی زرعی زمین، وہاں کے کارخانے انفرادی ملکیت سے نکل گئے یہ بھی درست ہے کہ ہر قدم پر ہزار ہا برس کے انفرادی ملکیت رکھنے والے زمینداروں، اور کسانوں کی طرف سے زبردست مزاحمت ہوتی ہے اور سوویت روس میں بھی ہوتی چنانچہ مزدور طبقہ جب کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور سوشلسٹ انقلاب کا پرچم کھلنے لگتا ہے تو اس انقلاب کی کامیابی کی راہ میں سب سے مشکل کام کسانوں کی چھوٹی چھوٹی تتر بتر کاشت کاری کو سوشلسٹ طریقے پر اجتماعی کھیتوں کی طرز پر منظم کرنے کا ہونا ہے اور جب اس میں کامیابی ہوتی ہے تو اس کی تبدیلی کے عمل میں کسانوں کی پوری ذہنی اور تہذیبی زندگی میں تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک دن کا عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ سالہا سال پر پھیلا ہوا عمل ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کے دوران بڑے پیمانے کی مشینی صنعت کا قیام ایک اہم شرط ہوتا ہے اور اس سارے عمل کا نتیجہ دوررس تبدیلی اور روحانی انقلاب ہوتا ہے کیونکہ سائنس اور انجینئرنگ کی تازہ ترین دریافتوں پر مبنی بڑے پیمانے کی سوشلسٹ پیداوار کے لیے ہنرمند مزدوروں، انجینئروں اور فنی ماہروں کا ہونا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے تعلیمی نظام کا مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر استوار کیا جانا بھی لازمی و لابدی ہو جاتا ہے چنانچہ یہ تمام ترقیاں اور تبدیلیاں ذہنی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں۔ اب جہاں زمین انفرادی ملکیت نہ ہوگی وہاں زمین کے لیے جھگڑا کیوں ہوگا؟ وہاں پانی کی

تقسیم کے لیے جدال وقتال کی فضا کیوں پیدا ہو گی۔ جب اس قسم کے جھگڑے نہیں ہوں گے تو ان سے نپٹنے کے لیے قوانین کیوں بنائے جائیں گے غرضیکہ بنیاد کے بدلنے سے اوپر کے تمام ڈھانچے بھی بدلنے شروع ہو جائیں گے اور ان میں توہمات، تقدیر اور تو اور عبادات کے تصورات بھی بدلنے شروع ہو جائیں گے جہاں تک عبادت اور اس کے طور طریقوں کا تعلق ہے وہ تو سرمایہ داری نظام میں بھی بدلنے لگتے ہیں اور جو رسم و رواج، تصورات و خیالات زمینداری نظام میں پائے جاتے تھے وہ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری نظام کا ہی تقاضا تھا کہ عیسائیت میں سود کے جواز کے لیے نیا فرقہ پیدا ہوا۔ اور رومن کیتھولک کو ہار ماننی پڑی۔ آج بھی وہ مستقل پیچھے ہٹتا چلا جا رہا ہے کیونکہ رومن کیتھولک کی اٹھان جاگیرداری کے دور میں ہوئی تھی۔ اس کی سرشت دراصل جاگیرداری ماحول کی پیداوار ہے اس لیے وہ پچھلی تین صدیوں سے ترقی پسند رجحانات کے خلاف قدم قدم پر مزاحمت کرتا ہے اور شکست کھاتا ہے۔ خواہ یہ طلاق کا مسئلہ ہو یا خاندانی منصوبہ بندی کا۔ اور اسی قسم کا عمل ہمارے ہاں جاری و ساری ہے۔ جب سرسید اور ان کے رفقاء نے سود کے جواز میں دلائل دینے شروع کیے تو کتنے ماتھوں پر بل پڑے تھے اور اس وقت سے لے کر اب تک سود پر بحث جاری ہے۔ لیکن سود ہماری زندگی کا مسلمہ اصول بن گیا ہے یہ جاگیری دور کی شکست اور سرمایہ داری نظام اور فکر کی جیت ہے۔ ہمارے عالم جن کی سرشت بالکل رومن کیتھولک کی طرح جاگیری دور کی تخلیق ہے۔ وہ آج بھی یہی رٹ لگائے جا رہے ہیں خاندانی منصوبہ بندی پر بھی انھوں نے لعن طعن کی۔ عائلی قوانین پر بھی انھوں نے انگلیاں اٹھائیں لیکن ہر جگہ انھیں پسپا ہونا پڑا۔ یہ تو کمیونسٹوں کی شرارتیں نہیں ہیں لیکن کون ان کو بتائے کہ یہ تاریخ کا جبر ہے۔ جس کے آگے وہ بے بس ہیں کمیونسٹوں کی برتری صرف اتنی ہے کہ وہ تاریخ کے جبر کی پشت پر کام کرنے والی قوتوں کو سمجھتے ہیں اور سمجھ کر اسی شعور کی بنیاد پر تاریخ کے جبر کے عمل کو تیز کرنے کی جدوجہد میں شریک ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کا ہراول دستہ ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی بنیاد ہے جس پر سامراج اور مقامی طور پر خصوصی مفادات کے حامل گروہ کمیونسٹوں کے سب سے بڑے دشمن ٹھہرتے ہیں اور سامراج۔ اس کے حاشیہ بردار بھی کمیونسٹوں

پر مختلف سمتوں سے حملہ آور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سامراج نے سوویت روس کے انقلاب کے پہلے دن ہی ہمارے برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ میں کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹیوں کو ایک "مذہب دشمن" محاذ کے طور پر پیش کیا اور اس کے پروپیگنڈہ کی بنیاد مدتوں انہی نعروں پر رہی کہ سوویت رُوس نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا ہے مساجد کو مسمار کر دیا ہے قرآن جلا دئے ہیں اس پروپیگنڈے کا مقصد بھی یہی تھا کہ عوام کمیونسٹوں کے سیاسی اور معاشی پروگرام پر کان دھرنے سے پہلے ہی ان سے بدظن ہو جائیں۔ چنانچہ یہ پروپیگنڈہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ ہمارے جیسے پس ماندہ ملکوں میں کمیونسٹ کا مطلب ہی یہ لیا جانے لگا کہ وہ خدا سے منحرف ہے لیکن اب جیسے جیسے کمیونسٹوں کے سیاسی اور معاشی پروگرام مقبول ہو رہے ہیں تو لوگ اس پروپیگنڈے سے بے نیاز ہو رہے ہیں لیکن اس بات کا انھیں یقین ہے کہ کمیونسٹ واقعی خدا کو اور مذہب کو نہیں مانتے۔ چنانچہ میری حج پر روانگی پر حیرانی کے جذبات کے پیچھے بھی یہی تاثر ہے لیکن جب میں نمازِ جنازہ میں شریک ہوتا ہوں۔ جب میں عیدین کی نمازیں ادا کرتا ہوں۔ جب میں فاتحہ خوانی کے لیے جاتا ہوں تو اس وقت حیرانی کیوں نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان روایات پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگ اس پر لوگ واقعی حیران ہو رہے ہیں کہ کوئی شخص جو ان روایات کو تسلیم نہیں کرتا وہ ان پر پندرہ سولہ ہزار روپے خرچ کرنے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہے ؟

کمیونسٹ پارٹی نے میری جو تربیت کی ہے اس نے میرے مذہبی رویوں کو کچھ اور بھی پختہ کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے کمیونسٹ لیڈر خود مذہب کی راہ سے کمیونزم کی طرف آئے تھے۔ پنجاب کی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی سکھ لیڈر ایسا نہیں تھا جو اکالی پارٹی اور گوردواروں کی تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو اور ان راستوں سے سیاست میں نہ آیا ہو۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنے عوام سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے مذہبی روایات کا دامن نہیں چھوڑا۔ مثلاً کسی نے بال نہیں کٹوائے کسی نے اپنی دوسری روایات کو ترک نہیں کیا اور تو اور مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ۱۹۴۳ء میں میری

شادی ہوئی تو سوہن سنگھ جوش اس میں شریک ہوئے لیکن انھوں نے کھانا نہیں کھایا۔ تاکہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ نہ ہو سکے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا کہ چھوٹی چھوٹی باتیں عوام کو خواہ مخواہ برگشتہ کر دیتی ہیں اسی طرح کمیونسٹ پارٹی میں شراب پر بہت زیادہ سختی تھی اور پارٹی کے آئین میں یہ شق باقاعدہ درج تھی کہ شراب سے پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ پارٹی کے لٹریچر میں مذہب کے خلاف کبھی کوئی مضمون یا کوئی بات ہرگز نہیں لکھی گئی۔

میری ان توجیہات سے اس امر کا جواز نہ ڈھونڈا جائے کہ مارکسزم کو اسلام یا کسی اور مذہب کا ملغوبہ بنا کر عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے یا اسلامی سوشلزم کو جائز قرار دیا جائے یا مذہب اور سیاست کو گڈمڈ کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سوشلسٹ سیاست اور معیشت کے عام مروجہ اصولوں کی بنیاد پر تبلیغ کی جائے نہ کہ ان کے لیے سند مذہبی تعلیمات سے لائی جائے کیونکہ اس سے قباحت یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ مذہبی دستاویزات اور تحریروں اور الہامی کتابوں سے سوشلزم کے چند اصولوں کی حمایت میں اقتباسات نکال لیتے ہیں تو سرمایہ داری نظام کے حامی اس سے بڑے بڑے اقتباسات پیش کر دیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ صف آرائی مذہبی بنیادوں پر شروع ہو جائے گی اور سیاست اور معاشی جنگ پسِ پشت جا پڑے گی۔ اس لیے جو جماعتیں اور افراد مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے اور سیکولر نظام پر اصرار کرتے ہیں وہ بے دین یا لامذہب نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصد دین کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہونے سے بچانا ہے۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے ہیں سامان ہوائی اڈے پر دے آئے ہیں اور بورڈنگ کارڈز BOARDING CARDS لے آئے ہیں سو اب روانگی کی ایک منزل ختم ہوئی اب رات کو ۹ بجے ہوائی اڈے پر پہنچنا ہے تاکہ ساڑھے دس بجے کے طیارے پر بیٹھ جایا جائے اب وہ دہشت اور بے چینی کا دور قدرے کم ہو گیا ہے اور کچھ اطمینان حاصل ہو رہا ہے۔ یہ دو دن جو کراچی میں گزارے ہیں اس میں ہزار قسم کے مشورے ملے ہیں کئی ایک نے ڈرایا ہے۔ کئی ایک نے قحط کے قصے بیان کیے ہیں۔ کسی نے کوئی قصہ بتایا ہے تو کسی اور نے کچھ اور ہی قصہ سنایا

ہے غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں اور میں بھی سب کی باتیں سنتا رہا ہوں لیکن میں تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دے رہا ہوں کہ اب گھر سے نکل جو کھڑے ہوتے تو اب پریشانی کیوں۔ جو ہوگا اس کا مقابلہ کر لیا جائے گا اور انشاءاللہ سب معاملات درست ہو جائیں گے۔

کل رات یہاں زہیر صدیقی کے ہاں کھانا کھایا یہ مجلس کافی پرلطف رہی اس میں انیس تھے ایم بی نقوی تھے ڈاکٹر آفتاب تھے کافی دیر گپ ہوتی رہی۔ عائشہ کا بھی دل بہل گیا اس لیے کہ سفینہ سے اس کی پرانی دوستی تھی۔ لیکن میں اس پرلطف مجلس اور خوشگوار ماحول میں بھی قدرے کھویا کھویا رہا اور میرا دھیان سفر کی طرف لگا رہا۔ آج حالت بہت بہتر ہے لیکن رہ رہ کر سوچتا ہوں کہ مذہب سے شیفتگی بھی عام لوگوں کو دکھ سہنے میں کتنی مدد کرتی ہے اور وہ ہزاروں صعوبتیں، ہنستے مسکراتے برداشت کر لیتے ہیں۔ اب یہ حج کو ہی لیجیے لاکھوں انسان اس فریضے کی ادائیگی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے ہیں لیکن اس سے ان کو سکون ملتا ہے۔ روح کی بے چینی دور ہوتی ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور مطمئن ہوں کہ یوں بھی ہوتا ہے لیکن عقل کی کسوٹی پر پورے اترنے والے اعتقاد ہوں یا عقل سے ماوراء اعتقادات ان دونوں سے مقصد روح کو سکون بہم پہنچانا اور اپنے من کی تشفی و تسکینِ قلب کا حصول ہے کسی کو ان اعتقادات سے تشفی ملتی ہے اور کسی کو کمیونزم کے لیے جدوجہد کر کے۔ ایک کے لیے یہ جدوجہد بے معنی اور لاحاصل اور دوسرے کے لیے یہ عبادات بے کار اور بے سود ہیں۔ لیکن دونوں کو اپنی اپنی راہوں پر چل کر ایک گونہ مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے اور ہر قسم کے اعتقادات اور ان کے لیے جدوجہد کا حاصل یہ لذت ہی تو ہے۔ اب میں اس میں کیا لذت حاصل کر رہا ہوں بس ابھی تک اس سے عائشہ کی خوشنودی اور اس کو مسرور و مطمئن دیکھ کر بے پناہ لذت اور سکون حاصل کر رہا ہوں۔ اب کل میری کیا کیفیت ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج کی کیفیت یہی ہے۔

۲۸ر دسمبر

جہاز میں بیٹھے کوئی ایک گھنٹہ گزر چکا ہے اور روانگی کی وحشت اور سفر کی صعوبتوں کا ڈر اور خوف قدرے کم ہو گیا ہے ہوائی جہاز سعودی عرب کی ایئر لائنیز کا ہے۔ اس کی ایئر ہوسٹس غالباً لبنانی ہیں۔ سفید دودھ جیسا رنگ۔ تیکھے نقش اور انگریزی پر عبور ہے۔ بہت ہی کم۔ ہوائی اڈے پر آفتاب نے جن افسرانِ کو کھلوایا ہوا تھا انھوں نے خوب دیکھ بھال کی۔ بلال، اس کی بیوی اور کوکو آخرِ وقت تک ہمارے پاس رہے۔ سچ یہ ہے کہ بلال نے اس سفر کے لیے بہت مدد کی وگرنہ قدم قدم پر رکاوٹیں آرہی تھیں لیکن بلال نے ہمت کر کے ان کو دور کر دایا اور خاصا وقت صرف کیا۔ جہاز میں اکثریت نے پہلے ہی احرام باندھ رکھے ہوئے تھے۔ میں اسی طرح سوٹ میں ملبوس تھا۔ دراصل ٹکٹ، پاسپورٹ، روپوں اور دوسری دستاویزات کے لیے یہ سوٹ پہنے رکھا بہر حال گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد احرام باندھا۔ کیونکہ احرام باندھنے کے لیے جو احکام ہیں ان کے مطابق میقات سے پہلے احرام باندھ لینا چاہیے۔ میقات ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں سے مکّہ شریف کو جانے کے واسطے احرام باندھتے ہیں اس سفر کے آغاز ہی سے میری

VOCABULARY میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور حج کے بارے میں معلومات اور دعاؤں کی کتابیں پڑھنے سے بہت سے نئے الفاظ سیکھے ہیں۔ زہیر نے ہی حج کے متعلق ایک کتاب دی تھی اس سے کافی فائدہ پہنچا۔

احرام پہنے ہوتے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ہندو جوگیوں کا لباس یاد آگیا۔ کیا اس لباس میں اور ہمارے احرام میں گہری مشابہت نہیں ہے؟ ہندو جوگیوں کے ہاں رنگ بسنتی یا گیروا ہوتا ہے اور یہاں سفید رنگ پر اصرار ہے۔

تقریباً ساڑھے تین بجے جہاز جدے کے ہوائی اڈہ پر اترنا شروع ہوا۔ جہاز سے جدے کی بتیوں اور قمقموں کی روشنی بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ دراصل جہاز میں شہروں کی بجلیاں مجھے بے پناہ خوبصورت اور بھلی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی خوب صورتی میں مسحور ہم میاں بیوی جدے کے ہوائی اڈے پر اترے اس وقت کئی اور جہاز ابھی اترے تھے اور ان سے بھی حجاج قافلہ در قافلہ اتر رہے تھے۔ یہ ہوائی اڈہ احرام پہنے ہوئے انسانوں کا سمندر نظر آتا تھا۔ افریقہ کے سیاہ فام سفید براق احرام میں قطار بنائے ہوتے جہاز سے جب اترے تو سیاہ و سپید کے امتزاج کا ایک عجیب و غریب منظر سامنے آجاتا رات کے اس سمے صرف افریقہ کے سیاہ فاموں ہی کے قافلے ہوائی جہازوں سے نہیں اتر رہے تھے بلکہ ان میں ایرانی تھے، ترکی بھی تھے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کے حجاج بھی تھے اور جدے کا وسیع و عریض ہوائی اڈہ انسانوں کا ایک سمندر دکھائی دیتا تھا۔ اور چاروں طرف لبیک اللھم لبیک کی گونج سنائی دے رہی تھی اور اس تسبیح میں ایک ترنم اور ایک خاص قسم کا ردِم RYTHM تھا جو جذبات میں ارتعاش اور رقت پیدا کر رہا تھا۔ دراصل یہ پورا سماں اور پورا ماحول ہی رقت انگیز تھا۔ اس وقت میرے اندر کا مسلمان انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ یہ وہی مسلمان تھا جس کی تربیت ایک خاص سانچے میں ان گنت پشتوں سے ہوتی چلی آئی تھی جس کو پشتہا پشت سے اس ماحول کے تقدس اسکی رقت انگیزی اور اس کی معصومیت کا درس دیا گیا تھا اور آج جب یہ ماحول میرے سامنے تھا تو رقت سے

میری آنکھیں پرنم تھیں اور میں چاروں طرف آنکھیں مل مل کر دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی اور پھر جدے کے ہوائی اڈے کی دھکم پیل، سامان کا حصول اور باہر نکلنے کی خواہش اِن سب نے آن گھیرا۔ اور میرے اندر کا مسلمان جو ابھی چند منٹ پہلے انگڑائی لے کر جاگا تھا وہ اس دھکم پیل اور شور شرابے میں دبک کر رہ گیا۔

جدے کے وسیع و عریض ہوائی اڈے پر ہر ملک کا ایک لاؤنج تھا۔ چنانچہ ہم پاکستانی لاؤنج میں پہنچے وہاں کچھ دیر کے بعد پاسپورٹ دکھائے۔ ہر پاسپورٹ پر انھوں نے ہمارے معلم کا نام لکھ دیا اور پاسپورٹ رکھ لیے ہیلتھ سرٹیفکیٹ واپس کر دیے۔ اس کے بعد سامان کا انتظار کرنے لگے۔ آخر سامان آیا۔ اس میں سے ہر مسافر کو اپنا سامان ڈھونڈھنا تھا۔ چنانچہ سب سامان ڈھونڈ لیا اور چیک بھی کروا لیا۔ ہاں چیکنگ کے دوران میرے بکس میں انگریزی کے ناول موجود تھے اس پر غور ہونے لگا۔ یہاں کمیونزم کی کتابوں پر کڑی نگرانی ہے۔ بہر حال خدا خدا کر کے فارغ ہوئے۔ لیکن بستر ندارد، بہت ڈھونڈا۔ کئی بار کاؤنٹر کے چکر لگاتے، سامان کی ٹرالیوں والے کمرے میں گیا وہاں پر موجود پاکستانی گائیڈز کو کہا لیکن بے کار، بستر کے سلسلے میں ایک قباحت اور تھی کہ اس پر صرف میرا نام درج تھا اور لاہور کا پتہ تھا۔ مگر معلم کا نام پتہ نہیں تھا اس لیے اس کا ملنا محال تھا۔ بہر حال صبر شکر کر کے ہم باہر کھلے میدان میں سامان لے کر پہنچے اور میں معلم کے نمائندے کی تلاش میں نکلا کہ اتنے میں پاکستانی مسافروں کے بستروں پر نظریں جمی رہیں۔ دوسرے لمحے ایک نئے بستر بند پر نظر پڑی میں نے قریب جا کر دیکھا کہ وہ میرا بستر تھا۔ اس پر میرا نام تھا۔ میرا کارڈ تھا۔ وہ کسی ان پڑھ پاکستانی حاجی نے غلطی سے بدل لیا تھا۔ چنانچہ وہ میں نے اٹھایا اور عائشہ جہاں سامان کے پاس بیٹھی تھی لے آیا۔ اس کی بھی جان میں جان آئی اس کے بعد معلم کے نمائندے کی تلاش جاری ہوئی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ یہاں جدے میں ہی معلم کا دفتر ہو گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ جدے میں معلم نہیں ہوتے بلکہ کئی ایک معلموں کا مشترکہ ایک دفتر اور ایک نمائندہ ہوتا ہے جو معلم کی فیس کا ڈرافٹ لیتا ہے اور مسافروں کو ٹیکسیوں میں بٹھا کر روانہ کر دیتا ہے۔ یہاں کاغذات

درست کروائے اور اس نمائندے نے وہ معلّمی کا ڈرافٹ لیا اور ہمارے ٹکٹ لے لیے اور پاسپورٹ ہمیں واپس کر دیا۔ یہ ٹکٹ ہماری واپسی کے دن سے ۲۴ گھنٹے پہلے ہمیں جدّے سے وصول کرنے ہوں گے اس پورے مرحلے میں تقریباً ۴ گھنٹے صرف ہو گئے جس وقت ہم ان مراحل سے فارغ ہوتے تو جدّے کے لیے ٹیکسی ڈھونڈی۔ ڈھونڈنا نہیں بلکہ معاملہ کرنا پڑا۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں ٹیکسیاں موجود تھیں یہ تمام کی تمام بیوک اور شیورلیٹ اور اسی قبیل کی بڑی بڑی موٹر کاریں تھیں۔ جن کو ہم اپنے ملکوں اور امریکی فلموں میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ بہر حال جس وقت ہم ٹیکسی والوں سے زبان نہ جاننے کے باوجود سودا کر رہے تھے تو تکرار ہو رہی تھی تو یہ اس سرزمین پر پہلا دھچکا تھا کہ ایک طرف رقت، عقیدت اور عبادت کی فضا ہے تو دوسری طرف زیادہ سے زیادہ کرایہ وصول کرنے کی دُھن ہے۔ جیسے بھی حاجی کی جیب کاٹی جاسکتی ہے کاٹی جاتی یہ پاک سرزمین تھی لیکن انسانی کمینگی تو یہاں بھی وہی تھی اس میں تو سرِ مُو کوئی فرق نہ تھا۔ بہر حال ٹیکسی والوں سے سخت معاملہ کرنا پڑا اور سَو ریال سے یہ ٹیکسی والے شروع ہوئے اور بالآخر ۸۰ ریال پر آگئے اس میں پانچ سواریاں بیٹھیں اس طرح ہم دونوں کو سولہ ریال دینے پڑے اور بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑے گا تجارت اور منافع عبادت پر حاوی ہے۔

موسم کافی خوشگوار تھا ابھی شب کی تاریکی باقی تھی ہواہیں تھوڑی سی خنکی بھی تھی اور جب موٹر چلی تو ٹھنڈی ہواؤں نے تھکان اتار دی۔ آہستہ آہستہ تاریکی چھٹنے لگی اور صبح کا سپیدہ ابھرنے لگا۔ راستے میں ایک پٹرول پمپ پر رُکے اور اس کے ملحقہ باغ میں وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی یہ اس سرزمین پر پہلی نماز تھی اور اس کے بعد پھر سفر شروع ہوا۔ چاروں طرف لق و دق صحرا ہی صحرا تھا اور صحرا کے درمیان یہ چوڑی سڑک ایک پتلی سی لکیر دکھائی دیتی تھی ہماری بیوک سرپٹ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اڑی چلی جارہی تھی اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ عائشہ نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں اس نے دعاؤں کی کتاب پکڑ رکھی تھی اور جیسے ہی ہم مکے کی حدود میں داخل

ہوئے تو اس نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

اللھم اجعل لی بھا قرارا وارزقنی بھا حلالا ط اللھم البلد بلدک والبیت بیتک جئت اطلب رحمتک واروم طاعتک متبعاً لامرک راضیاً بقدرک مسلماً لامرک واسلک سئلۃ المضطر الیک المشفق من عذابک ان تستقبلنی بعفوک وان تجاوز عنی برحمتک وان تدخلنی جنتک ط

اے اللہ مجھے قرار دے اور رزقِ حلال عطا فرما۔
اے اللہ یہ شہر تیرا شہر ہے اور یہ گھر تیرا گھر ہے۔
میں تیری رحمت کا طالب ہوں اور اسی کے لیے یہاں آیا ہوں۔
تیرے حکم کی پیروی کرتا ہوں۔
تیری رحمت چاہتا ہوں۔
تیری اطاعت کا قصد کرتا ہوں۔
تیری تقدیر پر راضی ہوں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں اور سوال کرتا ہوں۔ یہ ایک پریشان حال کا سوال ہے جو تیرے عذاب سے ڈرتا ہے۔
اے اللہ مجھے معاف کر دے، میری معذرت قبول فرما۔
اپنی رحمت کے ساتھ میرے گناہوں سے درگزر کر اور مجھے جنت میں داخل فرما۔

عائشہ عربی پڑھتی جاتی اور میں اس کا ترجمہ پڑھتا جاتا۔ واقعی اس وقت ایک ایک لفظ پر رقت طاری ہو رہی تھی اور آنکھیں پُرنم ہوتے جا رہی تھیں۔ مجھے یہ تمام عبارت بہت بھلی اور دل موہ لینے والی محسوس ہو رہی تھی۔ گو پڑھتے پڑھتے بھی مجھے اس کے ترجمے کے پھیکے پن کا احساس ہو رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ اس ترجمے کو اپنی زبان میں ہونا چاہیے جس میں RYTHM ہو۔ جس شعریت کا کیف ہو۔ اور جس طرح عربی کا RYTHM متاثر کرتا ہے اس طرح اردو کا ترجمہ بھی کرے۔

اور جب مکے کے اندر داخل ہوئے اور حرم پر نگاہ پڑی تو عائشہ نے میرا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے اور بلند آواز سے پڑھنے لگی۔

اللھم ان ھذا حرمك وحرم رسولك فحرم لحمی ودمی وعظمی علی النار اللھم آمنی من عذابك ویوم تبعث عبادك، واجعلنی من اولیاءك واھل طاعتك، وتب علی انك انت التواب الرحیم ط

ترجمہ - اے اللہ یہ تیرا اور تیرے رسولؐ کا حرم ہے۔
پس میرے گوشت، خون اور ہڈیوں کو آگ پر حرام کر دے۔
اے اللہ مجھے اپنے عذاب سے محفوظ رکھ۔ جس روز تو بندوں کو اٹھائے گا۔
اور مجھے اپنے ولیوں اور اطاعت گزاروں میں کر دے اور میری طرف توجہ فرما۔
بے شک تُو توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

ٹیکسی اب مکے کے اندر داخل ہو رہی تھی یہ بالکل ہمارے اندرون شہر کی طرح بازار تھا تنگ خستہ مکان، چاروں طرف بھیڑ اور ہجوم تھا۔ بہر حال ٹیکسی ہمارے معلم کے دفتر کے باہر جا کر رکی۔ ہم نے سامان اتارا۔ معلم کے ادارے کا نام سید عقیل عطاس اینڈ سنز امین اور عبداللہ تھا۔ یہ ادارہ ایک پرانے مکان میں واقع تھا۔ جس کی پہلے ڈیوڑھی تھی اس تنگ ڈیوڑھی کے دونوں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ حاجیوں کے سامان، بکسوں اور بستروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی گزر کر ایک کشادہ کمرہ تھا۔ اس میں ایک طرف اونچا تخت پوش بچھا ہوا تھا جس پر صندوقچی رکھی ہوئی تھی۔ یہ معلم اور اس کی غیر حاضری میں اس کے کارندے کے بیٹھنے کا انتظام تھا اس تخت پوش کے علاوہ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ اُونچی اُونچی بنچیں رکھی ہوئی تھیں جن پر گدے تھے یہ حاجیوں کے بیٹھنے اور سستانے کے لیے تھے اور درمیان میں حاجیوں کی ڈاک جو معلّم کے پتے پر آتی تھی وہ پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح کا کامن روم

تھا۔معلم سے ملاقات ہوئی یہ عقیل عطاس کا لڑکا تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔لمبا تڑنگا چٹا سفید، عربی لباس۔اردو، انگریزی، فرانسیسی سبھی زبانوں پر قدرے عبور رکھتا تھا۔ ایک بھائی وزارت اوقاف میں وزیر مملکت تھا۔ اس سے اس خاندان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔میں نے جاتی دفعہ احسان الٰہی ظہیر سے معلم کے نام ایک تعارفی رقعہ لیا تھا وہ میں نے اس کے حوالے کیا لیکن جس طرح معلم نے اس رقعے پر جو عربی میں تھا نگاہ ڈالی اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں ایسے رقعے بے معنی ہوتے ہیں اور افسوس ہوا کہ احسان الٰہی ظہیر کا خواہ مخواہ احسان کیوں لیا۔کیونکہ یہاں کسی قسم کے تعارفی رقعوں کی قدر نہیں ہوتی اور معلموں نے جو کھال اتارنی ہوتی ہے بہر حال اتار لیتے ہیں۔چنانچہ اس نے ہمیں ایک تنگ سی کوٹھڑی میں ستانے کے لیے کہا۔ہمارا تھکن، نیند اور قدرے بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے قہوہ، پنیر اور بسکٹ سے خاطر تواضع کی۔لیکن کمرے کی بُو باس سے دل خراب ہو گیا تھا۔بہر حال تھوڑا بہت زہر مار کیا طبیعت میں سخت گرانی اور گھبراہٹ تھی کیونکہ ابھی سر پر رہائش کی جگہ اور عمرے کے مراحل تھے دو تین گھنٹے میں اس نے دو تین کمرے دکھائے۔جب وہ ہمیں کمرے دکھانے کے لیے تنگ و تاریک اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں لے جا رہا تھا تو لاہور کی کچی آبادیوں سے بھی بدتر صورتِ حال تھی چاروں طرف تعفن، بو، گندگی اور گھٹن کا ماحول تھا۔اس فضا نے مجھ سے بھی زیادہ عائشہ کو بدحواس کر دیا بالآخر ہم کھلے بازار میں واپس آگئے اور بازار کے اُوپر ایک چوبارہ اس نے دکھایا۔اس فضا کو ہم نے غنیمت سمجھا اور یہاں ایک کمرہ بالآخر طے ہوا۔یہ لبِ سڑک ہے اور حرم سے دو منٹ پیدل کے فاصلے پر ہے لیکن کرایہ تیرہ سو ریال۔دراصل یہاں کرائے بہت زیادہ چڑھے ہوتے ہیں اور لوگ آٹھ آٹھ نو نو ایک کمرے میں گھس جاتے ہیں۔اس طرح ان کو سستا پڑ جاتا ہے لیکن ہم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ اپنی خلوت PRIVACY کی قیمت ادا کی وگرنہ وہ اس کمرے میں ایک یا دو اور آدمی گھسیڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تو سستا ہو سکتا تھا۔لیکن یہ کمرے دیکھ کر اس قدر کوفت ہوئی کہ مجھے سرینگر اور مری کے اندر کی کوٹھڑیاں یاد آگئیں جہاں لوگ آٹھ آٹھ دس گھسے رہتے ہیں اور وہی گلیاں، بدبو دار، متعفن۔غرضیکہ یہاں کمروں کے کرائے

اور ان کی صورت دیکھ کر مجھ سے کہیں زیادہ عائشہ کا موڈ خراب ہوا اور اس پر چڑچڑاہٹ طاری ہو گئی لیکن بہر حال جو کمرہ ہم کو ملا تھا وہ غنیمت معلوم ہوا۔ اور ماحول بھی مقابلتہً صفا اور قابل برداشت تھا۔ کمرے میں نیچے سامان رکھا۔ اس کے بعد وضو کر کے عمرہ کے لیے داخل ہوئے اس میں کعبے کا طواف ہے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینا۔ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں۔ کے پھیرے سبھی شامل ہو جاتے ہیں۔

ہم محلہ المسفلہ میں ٹھہرے۔ ہمارا چوبارہ برلب سڑک تھا۔ اصل میں بیت اللہ اور مسجد الحرام یا حرم شریف مکے کے بالکل وسط میں ہے اور حرم کے اردگرد سڑکیں جاتی ہیں۔ اور ان سڑکوں میں سے گلیاں نکلتی ہیں جو مکانات ان سڑکوں کے کناروں پر ہیں وہ زیادہ مہنگے ہوتے ہیں اور جتنا کوئی مکان حرم شریف کے قریب ہو گا اتنا ہی وہ گراں ہو گا۔ ہم سامان رکھ کر اور وضو کر کے عمرہ کے لیے نکلے تو ایک عجیب و غریب ہیبت تھی۔ مکے کے شہر میں ویسے کوئی جاذبیت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود ہجوم تھا کہ کشاں کشاں چلا آ رہا تھا۔ مرد و زن تھے کہ وہ اس شہر کے دیدار کے لیے ترستے تھے اور صدیوں سے یہ شہر دنیا کے کونے کونے سے لوگوں کو کھینچتا چلا آ رہا تھا اور آج بھی کشاں کشاں اس بھیڑ میں اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے گم ہوا جا رہا تھا۔ یہ پہلا دن تھا۔ یہ بھیڑ، یہ ہجوم پریشان کر رہا تھا لیکن ہم آہستہ آہستہ حرم شریف کی طرف بڑھ رہے تھے یہ سنگِ مرمر کی بلند و بالا عمارت اپنے حسن اور نفاست سے مرعوب کر رہی تھی اس شہر اور مسجد اور اس کے اندر کے بیت اللہ کے اردگرد ہزار ہا برس کی روایتوں اور عبادتوں کے تانے بانے بنے ہوتے ہیں اس شہر کے گلی کوچوں کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر کروڑ ہا انسانوں کے لیے مقدس تھے، محبوب تھے، محترم تھے۔ جب ہم حرم کی سیڑھیاں چڑھنے لگے اور اس کے بعد بلند و بالا دروازہ عبور کیا تو سامنے ہی نگاہ ایک عمارت پر پڑی جو سیاہ غلاف میں چھپی ہوئی تھی یہ کعبۃ اللہ تھا۔

جیسے ہی ہم نے اندر قدم رکھا تو عائشہ اور میں اونچی آواز سے پڑھنے لگے۔

(۱)

(۱)

بسم اللہ والحمد للہ والصلوٰۃ علی رسول اللہ اللھم افتح لی ابواب رحمتک وادخلنی فیھا اللھم انی اسئلک فی مقامی ھذا ان تصلّی علی سیدنا محمدٍ عبدک ورسولک وان ترحمنی وتتقبل عثرتی و تغفر ذنوبی، وتضع عنی وزری صلی اللہ علی محمد وآلہٖ وسلم اعوذ باللہ العظیم وبوجہ الکریم وسلطانہ القدیم۔ من الشیطان الرجیم؛ بسم اللہ۔ والحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ۔ اللھم اغفرلی جمیع ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک وادخلنی جنتک (۲) اعوذ برب البیت من الکفر والفقر ومن ضیق الصدر وعذاب القبر (۳) اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر؛

۱۔ ترجمہ :۔ شروع کرتا ہوں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کے نام سے اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور درود اسکے رسول کے لیے۔ اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور مجھے اس میں داخل کردے۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے اس مقام پر سوال کرتا ہوں یہ کہ رحمت نازل فرما۔ ہمارے سردار حضرت محمدؐ پر جو تیرے بندے اور رسول ہیں اور یہ کہ رحمت نازل فرما مجھ پر اور قبول کردے لغزش میری اور بخش دے میرے گناہ اور مجھ سے میرے گناہ دور کر دے۔ رحمت نازل ہو حضرت محمدؐ پر اور ان کی آل پر۔ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑی عظمت والا ہے اور اس کی کریم ذات کے ساتھ اور اس کی پرانی بادشاہت کے ساتھ راندے ہوتے شیطان سے

شروع اللہ کے نام سے ۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے ۔ درود اور سلام ہو اس کے رسول پر ۔ اے اللہ میرے تمام گناہ بخش دے اور اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے اور مجھے اپنی جنت میں داخل فرما دے ۔

۲:۔ میں پناہ مانگتا ہوں بیت اللہ شریف کے پروردگار کے نام کے ساتھ کفر سے اور فقر سے اور سینے کی تنگی سے اور قبر کے عذاب سے ۔

۳:۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور اللہ سب سے بڑا ہے ۔

ہزاروں مرد اور عورتیں ہمارے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھیں ۔ دھکم پیل سے برا حال ہو رہا تھا ۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے کیڑی کی چال سے آگے بڑھ رہے تھے بلکہ ہم نے اپنے کو ریلے کے سپرد کر دیا تھا ۔ پیچھے سے دھکا پڑتا اور ہمارا قدم بڑھ جاتا ۔ ایک طرف یہ دھکم پیل تھی اور دوسری طرف ہم پہ رقت طاری تھی ۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور میرے اندر کا مسلمان جاگ رہا تھا وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی رقت ، گریہ و زاری سے متاثر ہو رہا تھا اور ہزارہا برس کی تاریخ ، عبادت اور تقدس آج مجھ سے آنسوؤں اور گریہ زاری کے ذریعے سے خراج وصول کر رہا تھا ۔

ہم نے طواف کیے ۔ بھیڑ کے باوجود میں نے ہمت کی اور ہجوم کو چیرتا ہوا میں حجرِ اسود تک جا پہنچا اور اس کو بوسہ دیا ۔ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے چکر کاٹے لیکن یہیں میں نے جب اپنے اردگرد معلموں کے کارندوں کو حاجیوں کے آگے آگے عربی عبارت پڑھتے اور وہ اس کو دہراتے جاتے کا مظاہرہ دیکھا تو طبیعت بہت مکدر

ہوتی اور ایسا معلوم ہوا یہ حاجی نہیں، یہ عبادت گزار نہیں بلکہ یہ بھیڑیں ہیں جن کو گڈریے ہانکے چلے جا رہے ہیں۔ بہرحال ہم مطلوبہ اور مسنونہ عبادات مکمل کر کے گھر لوٹے اور بغیر کچھ کھائے تھکان سے نڈھال ہو گئے۔

۲۹ر دسمبر

یہاں صبح ہونے کو ہے۔ نماز فجر کے لیے حرم شریف میں بے پناہ ہجوم ہے اور میں یہیں بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ انسانوں کا یہ سمندر۔ یہ بحر بیکراں، تا حدِ نظر انسانوں کے سر ہی سر یہ تمام الفاظ میں محاورۃً استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ اس ہجوم کے سامنے شاہی مسجد میں عیدین کی نمازوں کے موقع پر ہجوم بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ اگر اس وقت جبکہ حج کو ابھی بارہ تیرہ دن رہتے ہیں یہ عالم ہے تو اس موقع کے منظر کو صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ آج مجھ پر نماز کے دوران اور ویسے بھی کئی بار رقت طاری ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری ہوتا رہا اور بعض دفعہ تو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں ویسے بھی بہت رقیق القلب ہو گیا ہوا ہوں بلکہ ایک حد تک شروع ہی سے تھا۔ لیکن جس وقت رقت کا زور کم ہوتا ہے پھر عقلیت پسندی RATIONALISM لوٹ آتی ہے تو سوچتا ہوں کہ یہ سب کیوں ہے؟ کیسے ہے؟

اس کا حتمی جواب تو میرے پاس نہیں ہے اور سچ یہ ہے کہ فلسفی اور کسی ماہر نفسیات کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ لیکن میں نے اسی حرم شریف میں بیٹھ کر یا طوافوں کے دوران یا صفا اور مروہ کے چکروں کے دوران عوام کی شیفتگی، والہانہ پن، ان کی گریہ زاری، ان کی گڑگڑاہٹ دیکھ

کر یہ محسوس کیا ہے کہ ان کو اس گریہ زاری، اس گڑگڑاہٹ سے کس قدر مسرت اور حظ محسوس ہوتا ہوگا اور وہ غموں سے بوجھ سے اپنے کو کتنا ہلکا محسوس کرتے ہوں گے لیکن میں ایک لمحے ہلکا محسوس کرتا ہوں تو دوسری گھڑی مجھے میری عقلیت پسندی، میری مارکسزم میرا دامن جھٹکنے لگتی ہے اور پھر میں یہ سب کچھ کیوں اور کیسے کے نہ ختم ہونے والے سوالوں کے چکروں میں کھو جاتا ہوں۔

یہ تضاد، یہ کش مکش، یہ جدوجہد، یہ مذہبی اعتقادات اور عقلیت پسندی اور مارکسزم کی ہاتھا پائی میری زندگی کا سرمایہ رہا ہے۔ اس نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا بلکہ اس نے مجھے زیادہ سے زیادہ جدوجہد پر اُبھارا ہے کیونکہ مجھے مارکسزم کے فلسفے اور مارکسی تعلیمات نے سماجی زندگی کے فلسفے اور اس کی تبدیلیوں کو جاننے کی جو بنیادیں مہیا کی ہیں اس پر مجھے کبھی شک نہیں ہوا۔ لیکن پھر یہ اعتقادات اور یہ رقت کیوں طاری ہوتی ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ جب میں یہاں ان گنت انسانوں کو ان اعتقادات کے لیے صعوبتیں اٹھاتے ہوتے دیکھتا ہوں تو ان کی تکلیفوں، ان کی پریشانیوں اور ان کی اپنے اعتقادات کے لیے لگن مجھ پر رقت طاری کر دیتی ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کے ان بنیادی اعتقادات سے دیس دیس کے لوگ جن میں گورے بھی ہیں اور افریقہ کے سیاہ فام بھی ہیں۔ ہم جیسے خطوں کے گندمی رنگوں کی نسلوں کے لوگ سبھی یہاں موجود ہیں کس قدر متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان اعتقادات کی تشفی کے لیے احرام باندھے یہاں دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھاتے یا حجراسود کو بوسہ دینے کے لیے بے تابانہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا جواب ہندوستان یا وسطی ایشیا یا پھر یورپ کا کوئی آدمی کیا دے سکتا ہے۔ یہ تمام عبادات اس کے اعتقاد کا حصہ ہیں۔ اس کی ذہنی تہذیب کا حصہ ہیں البتہ عربوں کے لیے یہ تمام اعتقادات اور عبادات ایک مسلسل جدوجہد کی تاریخ ہیں ان کے لیے ان میں کوئی تضاد نہیں۔ جب وہ روزہ رکھتے ہیں یا عیدین کی تقریبات مناتے ہیں یا پھر حج کی تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں تو ان کو ایک حظ آتا ہے اس لیے کہ یہ اعتقادات ان کے اپنے ہیں۔ ان کی اپنی زمین کے

ہیں اور ان کی اپنی زبان میں ہیں۔ ان کے لیے آدمؑ سے کر محمدؐ تک کا ایک تسلسل ہے ان تمام ادیان کا تسلسل ان کی تہذیب اور سماجی روایات کا حصہ ہیں۔ یہ پیغمبر، ان کی تعلیمات، ان کی تقریبات ان کے لیے معنی رکھتی ہیں، ان کی روایات کا حصہ ہیں اس لیے عربوں کے ہاں ان اعتقادات نے ان کی سماجی ترقی کی جدوجہد میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اور اعتقادات اور سماجی ترقی میں جو تضاد رونما ہونا شروع ہوا تو اس نے نئی صورت حال پیدا کر دی۔ یہ درست ہے کہ تضادات کا حل صبر آزما کاوش اور طویل جدوجہد کا متقاضی ہوتا ہے لیکن پھر بھی عرب ممالک میں یہ جدوجہد فکری پیمانے پر قدرے آسان ہو سکتی ہے لیکن عربوں کے ہاں پرولتاریہ کی پیدائش میں جو رکاوٹ پڑی ہوئی ہے وہ جیسے جیسے دور ہو گی ان تضادات کا حل ہوتا جائے گا اس وقت بھی یہ حج اور اعتقادات رہیں گے۔ لیکن اس کے معنی مختلف ہو جائیں گے اور شاید شکل بھی بدل جائے۔ جیسے رسولِ خدا نے حج کا جو اہتمام کیا تو یہ قبائلی زندگی کے ٹوٹنے اور شہری ریاستوں کے وجود میں آنے کے عمل کی نشاندہی کے طور پر اور قبائلی زندگی کی آویزش کو کم کرنے کے لیے یہ اعتقادات اسوقت بہت ممد ہو سکتے تھے اور اسلام میں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنے سے پہلے تمام ادیان کی روایات کو اپنایا اور ان میں ایک تسلسل قائم رکھا۔ چنانچہ حج، عیدین، جمعہ کا تقدس، یہ سب خصوصیات اسلام سے پہلے عربوں میں موجود تھیں اسلیے ان کیلیے ان عبادات میں کوئی نیا پن نہیں تھا اور تو اور نماز اور روزے بھی پہلے سے موجود تھے چنانچہ آج بھی یہودی روزہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام عبادات اور روایات کو اپنا کر اسلام نے اپنے خلاف مزاحمت کا اچھا خاصا زور توڑ دیا۔ اور اپنی قدیم روایات کو اپنا کر اسلام کے لیے دنیائے عرب میں ایک وسیع و عریض سلطنت کے لیے بنیاد رکھنی آسان ہو گئی اور اسی آسانی نے عرب تہذیب اور اسلام کو ایک عالم کے لیے باعث مقبولیت بنا دیا لیکن غیر عرب ممالک میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حج کو تہذیبی ورثے کے طور پر تو ہمیشہ اہمیت رہے گی لیکن فرض کے طور پر غیر عرب لوگ شاید کسی زمانے میں اس کو اہم نہ سمجھیں لیکن یہ نہ آج کی بات ہے نہ مستقبل قریب کی بلکہ اس کو سینکڑوں کیا ہزاروں

سال لگیں گے کیونکہ اعتقادات کو بنتے اور ان کی ماہیت کو تبدیل ہوتے مدتیں لگتی ہیں۔ اور جیسے معاشرے کے بنیادی ڈھانچوں میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو یہ عبادات کے NORMS بھی بدلنے لگتے ہیں اور بعض دفعہ ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی حال افراد کا ہوتا ہے کیونکہ اکثر لوگ اور قومیں اعتقادات اور عبادات کے ساتھ ساتھ کئی قسم کے توہمات کی زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں اور یہی توہمات انسان کو بدعت اور شرک کی دلدل میں کھینچ لے جاتے ہیں اور ان بدعات کے مہلک اثرات سے نجات حاصل کرنا کارے دارد بن جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض دفعہ انہی عبادات اور زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے بارے میں بھی ایک تضاد رونما ہونے لگتا ہے مثال کے طور پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کو لیجیے مسلمانوں کا ایک خاصا طبقہ اور گروہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ زیاں ہے اور ملکوں کی ترقی کے لیے یہ زیاں ایک وقت میں ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ مجھے اس موقع پر ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ یہ ایوب کے دور کے ابتدائی سالوں کی بات ہے اس وقت پر اے آئی سی ایس خورشید چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے ایک مختصر سی پریس کانفرنس طلب کی اس میں اور مسائل کے علاوہ گوشت کی گرانی کا تذکرہ شروع ہوا تو بات جانوروں کی کمی اور پھر عید قربان پر قربانی تک جا پہنچی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ قربانی کی بجائے نقد پیسے اگر خیرات کیے جائیں تو اجتماعی ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے ہم نے رپورٹ کر دیا اس پر مولانا غلام مرشد نے بھی قرآن و حدیث کے حوالوں سے اس تبدیلی کے حق میں آواز اٹھائی تھی بس پھر کیا تھا اس پر مخالفین نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے تھے۔ اس مخالفت میں میرے ممدوح مولانا داؤد غزنوی پیش پیش تھے۔ اس برصغیر میں یہ عجیب و غریب صورت حال رہی ہے۔ جو علمائے دین اور علماء کا جو مکتبِ فکر عام طور پر برطانوی شہنشاہیت کے مخالف اور قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گریزاں نہیں رہا وہ ایک طرف سیاسی میدان میں ترقی پسند رول ادا کر رہا تھا تو دوسری طرف سماجی اور معاشرتی میدان میں وہ زبردست رجعت پسند رول ادا کرتا نظر آتا ہے چنانچہ یہ بات دیوبندی اور اہل حدیث علماء پر صادق آتی ہے اس پورے علماء کے سلسلے میں

صرف ایک استثنیٰ ہے اور وہ ہے مولانا عبیداللہ سندھی کی۔ اس پوری صدی میں اس برصغیر نے ان سے زیادہ روشن خیال اور نابغہ روزگار عالم دین نہیں دیکھا ہے آج ان کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھا جائے تو الگ بات ہے لیکن آنے والا کل ان کو بہت اعلیٰ وارفع مقام عطا کرے گا اور ان کے خیالات تصورات وافکار کو مستقبل قریب میں اس برصغیر کے مسلمانوں کو قبول کرنے پڑیں گے کیونکہ یہ افکار سماجی تبدیلی کی سائنس کی بنیاد پر استوار ہیں۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا کہ جو عالم دین سماجی طور پر ترقی پسند تھے وہ سیاست کے میدان میں یا تو انگریز کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں یا سیاست سے دامن چھڑانے کے درپے ہوتے ہیں چنانچہ تمام سرکاری ملازم اپنے اسلام کو اکثر و بیشتر انہی سے وابستہ کرتے ہیں ان میں سرسید بھی ہیں اور اشرف علی تھانوی بھی اور آج کل کے عالم غلام احمد پرویز بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح عام طور پر برصغیر کے قوم پرست مورخ سرسید کو انگریز کا زرخرید ثابت کرتے نہیں تھکتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کا ایک اپنا فکر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فکر اور اس فکر کے عملی نتائج سے۔ برطانوی۔ شہنشاہت کو فائدہ پہنچتا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سے سرسید کے نزدیک مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔ لیکن اس سے تو انکار نہیں کہ سرسید نے مغربی علوم سے ناطہ جوڑ کر مسلمانوں کو ترقی کی راہ دکھائی بالکل اسی طرح جس طرح ہندوؤں کے اندر تقریب قریب سرسید سے نصف صدی قبل رام موہن رائے نے کے اندر روشن خیالی کی جوت جگائی تھی وہ رجعت پسند ہندوؤں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے تھے اور سرسید مسلمانوں کے رجعت پسند حلقوں میں نیچری کہلاتے اس لیے تاریخ میں نامور شخصیتوں کے رد و کد کی چھان پھٹک اور تجزیہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے کہ ان پر ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا لیبل فوراً چسپاں کر دیا جائے۔

ہاں تو میں بات عبادات سے متعلق کر رہا تھا۔ کیونکہ زمانے کے تقاضے جوں جوں بدلتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ کچھ عبادات کے انداز بھی بدلنے لازمی ہو جاتے ہیں لیکن صدیوں سے عبادات کے جو انداز ہمارے خون میں رچ بس گئے ہیں اور جن کے تقدس پر ہمارا یقین

محکم ہو چکا ہے ان کو بدلنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسی تمام روایات اور اعتقادات کو جو اجتماعی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوں ترک کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور راستے کا پتھر خود حکومتوں کا طبقاتی اور غیر جمہوری کردار ہوتا ہے وہ چونکہ عوام سے لاتعلق ہوتی ہیں۔ اس لیے ان میں عوام کی تربیت اور تعلیم کے لیے اور ان میں مسلسل تبلیغ کرنے کا کٹھن کام اپنے ذمے لینے کی سکت نہیں ہوتی اس کے مقابلے میں کمیونسٹ ممالک میں ایک طرف اپنی تنظیم اور دوسری طرف کمیونسٹ پارٹیوں، ٹریڈ یونینوں اور کسان سبھاؤں کے ذریعے عوام کی تربیت میں نمایاں آسانی رہتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں لوگوں کے تقاضے اور ضرورتیں بھی بدل جاتی ہیں وہ روایات اور عبادات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے پر بہت حد تک قادر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صرف سوشلسٹ ممالک میں ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی کئی فرقے ایسے ہیں جو ان عبادات کو ترک کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اب مثال کے طور پر اسماعیلیوں کو لیجیے ہم ان کو مسلمان تصور کرتے ہیں لیکن ان میں نہ تو قربانی کا رواج ہے اور نہ ہی ان کی عبادات اور مساجد دوسرے مسلمانوں کی مانند ہیں لیکن ان کے خلاف کسی جگہ بھی کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا۔ آخر کیوں؟ یہ الگ مضمون ہے کبھی اس پر اظہار خیال کروں گا۔

اسی طرح حج کے لیے بے بہا رقوم کا جو خرچ ہے اگر ان رقوم کو کسی اجتماعی منصوبے پر خرچ کیا جائے تو کتنا فائدہ ہو سکتا ہے اور ترقی کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے لیکن یہ کہہ دینا بھی کوئی آسان کام نہیں اور اس وقت جب میں یہ کہہ رہا ہوں تو لرزاں ترساں ہو رہا ہوں کہ علمائے دین ہی نہیں بلکہ عام مسلمان بھی معترض ہو گا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ آج سے چند دہائیاں پہلے کوئی خاندانی منصوبہ کے متعلق بات سننا بھی گوارا کر سکتا تھا؟ کیا مردوں کی نس بندی کے بارے میں کسی کو کہا جا سکتا تھا؟ یہ خدا کی خدائی میں مداخلت تصور ہوتی تھی۔ لیکن آج کیوں گوارا کیا جا رہا ہے اسلیے کہ ہماری معاشی زندگی کا انحصار اس پر ہے کہ

ہم آبادی کو کنٹرول کریں اس کے پھیلاؤ کو روکیں۔ اسی طرح ہماری معاشی زندگی کا آج تقاضا ہے کہ ہم زرمبادلہ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کریں۔ اب حکومتوں کو ایک طرف زرمبادلہ بچانا ہوتا ہے دوسری طرف اس کو زیادہ مقبول بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مسلمان ثابت کرنا ہوتا ہے بہرحال آج تیسری دنیا کے ملکوں میں یہ کش مکش کبھی بظاہر اور کبھی باطن میں جاری و ساری ہے۔ اسی طرح کئی ایک دوسری عبادات ہیں جیسے جیسے مسلمان ملکوں میں صنعتی زندگی کی تیزی اور سبک رفتاری آئے گی تو ان عبادات کی ظاہری شکل میں تبدیلیاں آئیں گی یا نہیں آج ممکن ہے کچھ واضح طور پر نہ کہا جا سکے لیکن صدیوں پہلے عیسائیت میں بھی تو عبادات کی جو شکلیں اور صورتیں تھیں وہ آج کہاں ہیں؟ اس کے باوجود یہ لوگ عیسائی باقی ہیں اور ان میں شیفتگی اور اپنے مذہب سے غلو کی حد تک لگن بھی ہے۔ اسی طرح کل اسلام میں اور مسلمانوں میں بعض ملکوں میں عبادات کے NORMS میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تو اس کا مطلب یہ مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسلام سے شیفتگی کم ہو گئی ہے۔ اب جو مسلمان نماز نہیں پڑھتے روزے نہیں رکھتے کیا ان کی اسلام سے شیفتگی کم ہو گئی ہے۔ کیا ہمارے قائدین، ہمارے رہنما سختی سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ نہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ تہذیبی مسلمان تھے اور یہی اپنی تہذیب سے لگاؤ اور اس تہذیب کی پشت پر کام کرنے والے معاشی اور سماجی تقاضوں نے ان کو الگ وطن کے حصول کے لیے متحرک کیا اس لیے مذہب کو صرف عبادتوں میں مقید کر دینا کوئی احسن کام نہیں۔

اس وقت پاکستان کے مطابق ڈیڑھ بجا ہے اور یہاں کے ساڑھے گیارہ ہیں لیکن سعودی وقت کے مطابق چھ بجنے کو ہیں۔ میں جو یہاں کے لوگوں سے سمجھ سکا ہوں کہ یہاں کے وقت کا تعین صبح اور شام سے ہوتا ہے جس طرح ہمارے ہاں وقت آدھی رات اور دوپہر سے متعین ہوتا ہے یعنی بارہ نصف شب کو بجتے ہیں۔

اسی طرح یہاں بارہ سورج کے غروب اور طلوع کے ساتھ بجتے ہیں اور اس طرح سے جمعہ کی اذان سعودی عرب کے وقت کے مطابق چھ بجے ہوتی ہے تو اس وقت اپنے ہاں کا

ڈیڑھ بجا ہے صبح کے ساڑھے چھ بجے ہم گھر سے نکلے تھے اور اب ڈیڑھ بجے لوٹے ہیں اور اب تیار ہو کر پھر جمعہ کی نماز کے لیے جا رہے ہیں۔ جس وقت ہم گئے تھے تو تہجد کی اذان ہو رہی تھی۔ یہاں تہجد کی بھی اذان ہوتی ہے گو اس کی جماعت نہیں ہوتی، ساڑھے چھ بجے سے لے کر دس بجے تک آج حرم شریف میں نمازوں اور عبادت میں گزرا۔ آج میں نے بالآخر پھر ایک بار پوری طرح دھکم پیل میں حصہ لے کر حجرِ اسود کا بوسہ لے ہی لیا۔ یہ عبادت کی بہت بڑی کامیابی تصور ہوتا ہے۔ نہیں تو ننانوے فیصد طواف کرنے والے ہاتھ کے اشارے ہی سے اس سیاہ پتھر کو چومتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر دس بجے ہم حرم سے نکلے ناشتہ کے لیے ہوٹل میں گئے۔ حج کے زمانے میں اس صبح کے وقت حرم کے باہر عرب نادار خواتین بھی گھروں سے پراٹھے، نان، ترکاریاں وغیرہ پکا کر لے آتی ہیں اور وہ زمین پر رکھ کر فروخت کرتی ہیں ہم نے ایک پراٹھا اور دو میٹھے پوروں کے ٹکڑے اور چائے کی دو پیالیوں کے ساتھ ناشتہ کیا اس کے لیے ہم کو تقریباً ڈیڑھ ریال صرف کرنا پڑا۔

تقریباً ۳۶ گھنٹے ہو گئے ہیں اس میں مجھے اجابت بھی نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود طبیعت بوجھل نہیں ہے۔ ناشتے کے بعد ہم نے بلال کو تار اور خط کے لیے ڈاک خانہ گئے تو معلوم ہوا کہ ایک گھنٹے کے بعد ڈاک خانہ کھلے گا۔ جب ایک گھنٹے کے بعد آئے تو چھ لفظوں کے تار کے ۲۲ ریال کا مطالبہ ہوا۔ تار کا ارادہ ترک کر کے خط ڈالنے کا فیصلہ کیا ایرو گرام یہاں سے نہیں ملا۔ لفافہ الگ سے دو قرش کا اور اس کے اوپر ٹکٹ ساڑھے بارہ قرش یعنی ساڑھے چودہ قرش تقریباً ڈھائی پونے تین روپے کا یہ خط پڑا۔ یہ کوئی مہنگا نہیں کیونکہ اگر پاکستان سے بیرون ملک خط ڈالا جائے تو اس سے کچھ زیادہ ہی خرچ ہوتا ہے اس کے بعد آج خوب جی بھر کر WINDOW SHOPING کی۔

اس وقت اپنے وقت کے پونے تین بجے ہیں اور پھر حرم شریف میں نماز جمعہ کے لیے پہنچا ہوں پورے حرم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بصد مشکل مروہ کی پہاڑی والے گنبد میں جگہ

ملی ہے یہ جگہ بھی پر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے اب تک خالی رہنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں سے کعبۃ اللہ کی عمارت پر براہ راست نظر نہیں پڑتی اور ہر شخص مرد اور عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نماز کے لیے جگہ وہ حاصل کرے جہاں سے وہ بیت اللہ کے اولاً بہت ہی قریب ہو دگر نہ کم از کم اس پر نگاہ پڑتی ہو چنانچہ اسوقت امام عربی میں خطبہ دے رہا ہے اور میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

آج ۴۸ گھنٹے کے بعد نہایا ہوں۔ پانی کی قلت ایسی نہیں جتنی کہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے ویسے جس تیزی سے مکہ پھیل رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے باوجود حاجیوں کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس تعداد کو اگر سامنے رکھا جائے تو ہر سال اس فرض کی تکمیل کے لیے آتی ہے تو اس کو برا بھلا کھپانا کوئی آسان کام نہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب کی حکومت بہت تیزی سے اب تعمیراتی پروگرام پر عملدرآمد کر رہی ہے اور سر بفلک اور صدہا منزل عمارتیں دھڑا دھڑ وجود میں آ رہی ہیں اور جدھر دیکھو پرانا مکہ گرا کر نیا مکہ تعمیر ہو رہا ہے اور ایک منزلہ کچے اور بوسیدہ مکانوں کی جگہ اب کنکریٹ کی درجن منزلہ عمارتیں بن رہی ہیں نئے نئے پل تعمیر ہو رہے ہیں ایک ہوٹل الفتح ہے یہ حال ہی میں تعمیر ہوا ہے اس کے ایک ڈبل بیڈ روم کا ایک مہینے کا کرایہ پانچ ہزار ریال ہے۔ اس میں صرف ناشتہ شامل ہے۔

اس وقت شام کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا ہوں۔ میرے ساتھ ایک افریقی حبشی کھڑا تھا اور دوسری طرف ایک ترک بزرگ کھڑا تھا وہ کوئی زیادہ بزرگ بھی نہ تھا۔ اس نے مجھے لکھتے دیکھا تو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے اُسے خود ہی بتا دیا کہ اُردو ہے اور پاکستانی ہوں اس سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اشاروں اور زبان سے کہنے لگا کہ وہ ترکیہ سے آیا ہے اور اس کا نام عمر ہے اس کو عربی رسم الخط میں لکھنا آتا ہے اور اسنے اپنا نام مجھے لکھ کر بتایا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اسلام ہو یا عیسائیت ان مذاہب کے حوالے سے بھی کتنے بین الاقوامی رشتے قائم ہیں۔ یہ پڑھتے اور سنتے آئے تھے لیکن اس کا عملی طور پر احساس نہیں ہوا تھا ان رشتوں

کو انقلاب اور ترقی کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور آج اسلامی ممالک کی ایکتا میں یہ دو رجحان بہت واضح ہیں۔ ایک رجحان تو یہ ہے کہ اسلامی ممالک کے اتحاد اور ایکے کو تیسری دنیا کی ترقی اور سماجی انصاف کی تحریک کا حصہ بنایا جائے دوسرا رجحان یہ ہے کہ سماجی انصاف کی تحریک کو روکنے کیلیے اسلام اور اسلامی ممالک کے اتحاد کو استعمال کیا جائے۔

اس وقت حرم کی اوپر کی چھت پر بیٹھا ہوں۔ ٹھنڈی ہوا فرحت بخش رہی ہے اور اس ترک باشندے نے مجھے عطر لگا کر اپنی دوستی اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ یہ بین الاقوامیت بھی کس قدر دل موہ لینے والی ہوتی ہے۔ یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ کمیونسٹ کانگرسوں اور کانفرنسوں میں اس کا تجربہ ہوا تھا۔ اس بین الاقوامیت میں ایک سائنسی اندازِ فکر ہوتا ہے لیکن اس بین اقوامی اپنائیت میں ایک بے ساختہ پن ہے اگر اس اپنائیت کو سائنسی اندازِ فکر سے لیس کر دیا جائے تو یہ بھی ایک بہت بڑی طاقت بن سکتی ہے اور اس لحاظ سے اگر کل جب سعودی عرب میں ترقی پسند حکومت قائم ہوگی تو اس عظیم اجتماع کو انسانیت کے لیے کتنا مفید اور سُود مند بنا سکے گی اور اگر فرض کر لیجیے کہ کل کو سعودی عرب میں سوشلسٹ افکار کی حامل حکومت قائم ہو جائے تو رجعت پسند مسلم حکومتیں حج پر جانے پر پابندی لگا دیں۔ یوں بھی ہونا ہے۔

---

۳۰ ؍ دسمبر

وہی صبح کا وقت ہے حرم شریف میں بیٹھا انسانوں کے نظارے کر رہا ہوں۔ تہجد کی نماز نہیں پڑھی ہے بے حد فرحت بخش ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور عقیدت مند طواف کر رہے ہیں۔ یہ طواف کے دوران ان کا والہانہ پن اپنی جگہ درست ہے اس کی پشت پر ایک ان دیکھے خدا اور رسولؐ سے عقیدت اور پرستش کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ یہ ہزاروں لاکھوں انسان یہاں طواف کر رہے ہیں دعائیں مانگ رہے ہیں یہ تو ایک اندھی عقیدت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جس

کی پشت پر صدیوں کا تقدس اور درجنوں نسلوں کی تہذیب موجود ہے مگر جب ترقی یافتہ اور سائنسی نظریات کے حامل انسان اپنے رہنماؤں کے مقبروں پر جاتے ہیں اور حکومتیں اور قومیں اپنے رہنماؤں کے گرد تقدس کا ہالہ بنتی ہیں ان کے نظریات، فلسفے اور افکار کے بارے میں دن رات تبلیغ ہوتی ہے۔ یا جب لینن کے مقبرے کو سوویت کے باشندے دیکھنے کے لیے جاتے ہیں یا ہم باہر کی دنیا میں بسنے والے کمیونسٹ اس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں تو اس میں بھی ایک گونہ پرستش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ جب ہم نے سٹالین کو عظیم باپ کہہ کر پکارا تھا یا ماؤزے تنگ کو خراج عقیدت ادا کرتے ہیں تو یہ کیا ہے۔؟ بنیادی طور پر انسانوں کی بے بسی اور قدرت پر قابو پانے میں جو ابھی خامیاں رہ گئی ہیں یہ اسی کا اظہار ہے انسان میں عدم تحفظ کا جو احساس پایا جاتا ہے یہ اس کے مختلف مظاہر ہیں یہ مظاہر مل کر انسان کو کسی طاقت کسی فرد کی پرستش پر اکساتے ہیں۔ جب ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ عبادت کرتے ہیں کعبہ کا طواف کرتے ہیں گڑگڑا کر التجائیں کرتے ہیں بیماروں کے لیے شفا مانگتے ہیں روزگار مانگتے ہیں۔ غربت سے نجات چاہتے ہیں تو بھی اور جب ہم مارکس، اینگلز، لینن، سٹالن، ماؤ اور کمیونسٹ رہنماؤں کے گیت گاتے ہیں اس کی پشت پر یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر اور عظیم انسان ہیں ان کا بنایا ہوا راستہ ہمیں اس منزل پر لے جائے گا جہاں ہماری خواہشات پوری ہو جائیں گی کمیونزم کے لیے جدوجہد بھی انسان کی بے بسی کے خلاف جدوجہد ہے لیکن ایک بنیادی فرق بھی ہے کہ کمیونزم اور اس کے افکار انسان کی بے بسی کے خلاف جدوجہد کا اسلوب متعین کرتے ہیں، راہ دکھاتے ہیں اور عوام کو جدوجہد کے لیے متحرک کرتے ہیں لیکن دوسری طرف عبادات کے ذریعے کایا کلپ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا نتیجہ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس کے مقابلے میں جب کمیونسٹ، کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت میں جدوجہد کرتے ہیں، وہ مزدوروں کو منظم کرتے ہیں کسانوں کو متحرک کرتے ہیں تو اس دوران میں وہ انسانی بے بسی کی زنجیروں کو کاٹ ڈالتے ہیں اور وہ اس عمل کے دوران انسان کو نئے اعتقاد اور دلدل سے دوچار کر دیتے ہیں

جس کے بعد یہ رسمی عبادات اس کو زیادہ متاثر نہیں کرتیں۔ ور میں سوچتا ہوں کہ میں جو آج ان عبادات پر سر دھن رہا ہوں اس کی کہیں یہی وجہ تو نہیں کہ جس جدوجہد اور عمل نے مجھے کمیونسٹ بنایا تھا وہ جدوجہد کہیں مفقود تو نہیں ہو گئی کہیں اس سے میرا رشتہ کٹ تو نہیں گیا۔ کیونکہ ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ کیا کوئی کمیونسٹ صحیح معنوں میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنے بغیر ہو سکتا ہے تو نتیجہ یہی نکلا تھا کہ کمیونسٹ بننے کے لیے پارٹی کی رکنیت لازمی ولابدی ہے دراصل پارٹی کی رکنیت کا مطلب کیا ہے وہ مطلب ہے جدوجہد میں شرکت اور نظم وضبط کی پابندی چونکہ اسی عمل سے تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ بہتر کمیونسٹ بنتا ہے اور غالباً میں جو "کیوں" اور "کیا" کے چکر میں پھنسا ہوں تو اس کی پشت پر بھی ہمارے ملک کی کی کمیونسٹ پارٹی کی عدم موجودگی اور اس عملی جدوجہد میں لاتعلقی ہے جس نے میری تمام روشن خیالی کے باوجود مجھے ایک Blind faith میں پھنسا دیا ہے۔ چونکہ سچ یہ ہے کہ مارکسزم سماج کی تبدیلی کے اصولوں کی اگر سائنس ہے تو جو شخص اس تبدیلی کو روبکار لانے کے عمل میں شریک نہیں ہوتا وہ مارکسی کیسے کہلا سکتا ہے۔

اگر ان بنیادوں پر سوشلسٹ ممالک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو صورت حال قدرے واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سوشلسٹ ممالک میں مقابلتہً تحفظ مل جاتا ہے بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ بیروزگاری اور فاقہ کشی سے نجات مل جاتی ہے اس لیے وہاں عبادت کا جذبہ قدرے مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے اور ان عبادات میں عقل اور ادراک پوری طرح کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہم جیسے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کا تعلق ہے جہاں ابھی فیوڈل ہی نہیں ہے بلکہ بعض حالتوں میں قبائلی رشتے موجود ہیں وہاں تو خدا کی وحدانیت کو بھی سچے دل سے ماننا اور اس پر اعتقاد لانا ایک بہت ہی ترقی پسند اقدام ہے لیکن فی الواقعہ ہمارے ہاں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا انسان اکثر وبیشتر زبان سے تو ان دیکھے خدا کی پرستش کرتا ہے لیکن دل میں کسی فرد کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے وہ اس فرد کی تصویر کو اپنے سینے میں اتارتا ہے اور اصل میں غیر شعوری

طور پر اس کی پرستش کرتا ہے اور جیسے ان دیکھے خدا کی پرستش انسانی ترقی کی ایک اعلیٰ منزل تصور ہوتی ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لیے انسان نے ہزاروں لاکھوں برس تک جدوجہد کی۔

راستے میں اس نے کتنے دیوی دیوتاؤں سے منہ موڑا کتنے قدرتی عناصر کی پرستش کی اور پھر ان کو مسخر کیا اور پھر ان کی پرستش سے توبہ کرلی اس نے ہزارہا سال تک بت تراشے اور ان کے سامنے سربسجود ہوا۔ تا آنکہ اس نے قدرت کے تمام عناصر کو اپنا تابع کیا دیوی دیوتاؤں کو ٹھوکر ماری، بتوں کو مسمار کیا اور ایک ان دیکھے خدا کو اس کو اس نے دل میں اتارا اس کے سامنے سربسجود ہوا۔ تمام دُوسرے خداؤں سے اس نے انکار کر دیا ایک خدا پر اعتقاد انسانی عقل و ادراک کا مظہر ٹھہرا۔ انسانی ترقی کی ارفع و اعلیٰ منزل قرار پایا اور کون جانے کہ آج سے سینکڑوں اور ہزاروں برس بعد خدا کے وجود سے انکار اس سے بھی اعلیٰ اور ارفع منزل قرار پاتے اور شاید اسی لیے سوشلسٹ ممالک ہیں یہ عمل رونما ہو رہا ہے لیکن ہمارے ہاں تو ابھی تک ان دیکھے خدا کی پرستش کی راہ اور اس کی وحدانیت کے اقرار میں بھی ہزاروں لاکھوں مشکلات ہیں اور کروڑوں انسان زبان سے اس کی وحدانیت اور اس کی عظمت کے راگ الاپ کر بھی مختلف افراد کو اس کے ساتھ عظمت کے سنگھاسن پر بٹھا دیتے ہیں مثال کے طور پر جب ہم پیروں اور اولیاؤں کی تمام برگزیدگیوں کے باوجود ان کو اپنے دل میں متشکل کرتے ہیں تو اصل میں ہم افراد کے لیے جذبۂ پرستش کی تشفی کرتے ہیں تصور تصور میں ہی ان کو متشکل کر کے آبدیدہ ہونا یہ خدا کی عظمت کی نفی نہیں تو اور کیا ہے ؟ کہیں انسان کو انسان کی اطاعت کر کے، پرستش کر کے، عبادت کر کے ایک گونہ حظ تو نہیں ملتا ؟ ہم کہیں ان دیکھے خدا کی تمام قدرتوں، تمام عظمتوں کو کسی انسان کی شکل میں متشکل کر کے اس کے قصیدے تو نہیں گانا چاہتے ؟ ایسے جب کوئی شخص انسانی پرستش کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو وہ انسان کو ایک منزل آگے کے سامنے سرنگوں ہونا تو نہیں چاہتے ؟ یا اس کی اطاعت تو نہیں کرنا چاہتے ؟ یا عظمت جب کوئی شخص انسانی پرستش کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو وہ انسان کو ایک منزل آگے

لے جاتا ہے اور ظاہر ہے انسانی پرستش سے منع کرنے والا گروہ اقلیت میں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حنبلی اور اہل حدیث اقلیت میں ہیں اور انسان اور خدا دونوں کی پرستش سے انکار کرنے والے اس بھی زیادہ اقلیت میں ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود لینن کی نعش کو محفوظ ضرور رکھیں گے۔ یہ انسان کی ایک اپنے جیسے انسان کی پرستش کے جذبے کی تشفی نہیں تو کیا ہے!

ہاں جس تعداد میں عورتیں مذہب کی شیفتہ اور شیدائی ہوتی ہیں اس سے بھی یہ بات کسی حد تک ثابت ہوتی ہے کہ وہ خدا سے زیادہ رسول، پیروں اور اولیاؤں کو مانتی ہیں جس وقت وہ خاوند کو مجازی خدا کہتی ہیں تو یہ خدا کو متشکل کرنے اور انسان کی پرستش کے جذبے کی تشفی نہیں تو اور کیا ہے یہاں حج پر آنے والی خواتین کی تعداد اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں آخر کیوں؟ دنیا بھر میں خواتین زیادہ مذہب پرست ہوتی ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے ان میں انسان پرستی کا جذبہ بے پناہ طور پر زیادہ ہے۔ یہاں غریب، نادار، بوڑھی، جوان اتنی تعداد میں خواتین ہیں کہ کہا نہیں جاسکتا۔ عورت دنیا میں مرد سے کہیں زیادہ غیر محفوظ ہے۔ جو بھی زیادہ غیر محفوظ ہوگا وہ زیادہ مذہبی ہوگا۔

اس وقت عصر کی نماز ہو چکی ہے اور ہم عصر کے بعد اُوپر کی چھت پر بیٹھے ہیں۔ آج پورا دن حساب کتاب اعصاب پر سوار رہا۔ معلّم کو مکان کا کرایہ اور مدینے اور عرفات کے اخراجات سترہ سو ریال ادا کرنے ہیں۔ ہمیں کل ریال ملے ہیں ۲۳۵۰۔ اب بقایا سات سو ریالوں میں ہم کو ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزارنا ہے۔ مدینے جانا ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں سے قربانی دینی ہے۔ اب یہ جو سوچ ہمیں ہے یہی سوچ ہم سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر دوسروں کو بھی ہوگی۔ ان سوچوں اور عبادت کی یکسوئی میں کوئی تضاد ہے کہ نہیں۔ بہر حال ہم ایک دوسرے کو تسلی دے کر اپنے آپ کو بہلا رہے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد حرم شریف سے اس ارادے کے ساتھ نکلے کہ بازار سے

سبزی لے کر گھر جا کر پکا لیں گے اور اس سے ایک دو دن گزارہ کریں گے کیونکہ اب کفایت کھانے میں ہی کی جا سکتی تھی اور ویسے بازار سے جو کھانا ملتا ہے وہ گوشت اور سالن کی حد تک تو بہت ہی خراب اور بد ذائقہ ہوتا ہے ایک رات ہم نے مٹر قیمہ کی آدھی پلیٹ ایک ریال میں لی لیکن ایک نوالہ لے کر ہم نے واپس کر دی۔ کل ایک مالیبار کے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانا کیا تھا یہی دال کی دو پلیٹیں اور ہمارے ہاں کی پھلکے نما دو چپاتیاں۔ دو اور ڈیڑھ ریال۔

ویسے یہاں پر بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی موجود ہیں جن کو عربی اچھی خاصی آتی ہے اور وہ گھل مل گئے ہیں۔ غالباً یہاں صدیوں سے IMMIGRATION کا عمل جاری ہے ہمارے ہاں سے بھی صدیوں سے علماء اور دوسرے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے ہیں ایک طبقہ تو علماء کا ہے کہ جو یہاں آ کر آباد ہوا اور اس نے یہاں باقاعدہ درس و تدریس کا کام شروع کیا اور اس میں بھی انھوں نے نام پیدا کیا۔ حضرت مولانا گنگوہی عبیداللہ سندھی اور ابھی حال ہی جن کا انتقال ہوا حافظ حبیب اللہ پسر مولانا احمد علی۔ میری مدتوں سے خواہش تھی کہ یہاں آ کر ان سے ملوں۔ اس لیے کہ میرے ان کے ساتھ بہت پرانے دوستانہ اور برادرانہ مراسم رہے ہیں اور ہمیشہ میں نے ان کو یاد رکھا لیکن جب یہاں آنے کا موقع ملا تو وہ اسی سال وفات پا گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

حرم شریف سے نکل کر بازار سے سبزی خریدی لیکن جب گھر پہنچے تو عائشہ کی طبیعت کچھ مضمحل تھی اور وہ تھکی ہوئی تھی۔ دراصل یہاں طوافوں اور چل چل کر اس کو تھکان ہو گئی ہے اس سے اسے نیند کا غلبہ بھی تھا۔ چنانچہ اس کے بعد گھر پر ہی نمازیں پڑھیں اور خشک میوہ کھا کر سو گئے۔

۳۱ر دسمبر

اتوار کا دن ہے۔ رات نیند خوب پوری کر لی ہے اور تہجد کے لیے حرم شریف پہنچ گئے ہیں۔ اب یہ سطور تہجد کی نماز ادا کر کے لکھ رہا ہوں اُوپر کی چھت پر بیٹھا ہوں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اُوپر کی چھت بھی پُر ہوتی جا رہی ہے ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی اوپر کی چھت سے نیچے طواف کرنے والوں کا منظر بہت ہی دلفریب لگتا ہے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جیسے آہستہ ہنگھوڑا گھوم رہا ہے اور ان ہنگھوڑوں پر لوگ بیٹھے بہت ہولے ہولے ہلکورے لے رہے ہیں۔ دن رات ہر گھڑی طواف کرنے والوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ سکون سے طواف نہیں ہو سکتا۔ حج فرض ہے لیکن عبادت اور دل جمعی کے ساتھ۔ عبادت تو ویسے عمرے کے دوران زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔

آج میں سوچ رہا ہوں کہ عبادت کے مخصوص انداز NORMS کیوں متعین کئے گئے ہیں۔ کیا اللہ کے حضور ان انداز NORMS کے بغیر نہیں جایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص ویسے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتا ہے اور اسے پکارتا ہے۔ بخشش چاہتا ہے تو ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟

عیسائیوں کے ہاں بھی تو کسی زمانے میں عبادت کے بعض مخصوص انداز NORMS ہوں گے اب ان کے ہاں اتوار کا دن عبادت کے لیے مخصوص ہو گیا ہے یہ آخر کیوں ہوا؟ اس موضوع پر RISE OF CAPITALISM میں قریب قریب یہی موقف اختیار کیا گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ طرز معیشت (کیپٹل ازم کے رواج پانے کے ساتھ ہی عبادت کے انداز NORMS میں تبدیلی لازم ہو جاتی ہے کیونکہ جو ادیان قبائلی طرز معیشت اور سماج کی پیداوار ہوتے ہیں اس زمانے میں عبادت کے NORMS کی مختلف ضرورتیں تھیں چونکہ زندگی مختلف تھی۔ رہنے سہنے کے طور طریقے مختلف تھے اور وقت اور فراغت بہت

دافر تھی چنانچہ اسی انداز سے عبادت کے اوقات اور طور طریقے قرار پاتے جس طرح طرزِ معیشت کے بدلنے سے ہم نے مذہب کی دوسری تعلیمات میں یا تو تبدیلی تسلیم کرلی یا ان پر اغماض برتنے پر رضامند ہو گئے اسی طرح عبادت کے انداز NORMS کا بھی حال ہو رہا ہے اور آئندہ اور تیزی سے ہو گا۔ اب مثلاً سود کے بارے میں بحثیں تک ختم ہو گئیں اور سود لینا دینا بہرحال رواج پا گیا اور مذہب بہت حد خاموش ہو گیا۔ پردہ قصۂ پارینہ بن گیا۔ اخلاق کی اقدار میں تبدیلی لازم ہو گئی اور تو اور اب عملی PRACTISING مسلم خال خال ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ پانچ وقت مساجد میں جانا اور مصروف زندگی میں سے دو تین گھنٹے نکالنا یہ کیسے ممکن ہے کہ اب کارخانے کی ایک شفٹ SHIFT کے لیے مزدوروں کو ظہر اور عصر کے لیے چھٹی دیں تو کتنا وقت ضائع ہوا اور پیداوار کتنی کم ہوئی اور مالک کے منافع میں کتنی کمی ہوتی یہ عملاً دشواریاں ہیں جو پیش آرہی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نئی ضرورتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی مصلح آئے گا خواہ وہ مجدد کہلائے یا کچھ اور۔ وہ عبادت کے طور طریقوں میں تبدیلی لائے گا یہ مسلم بورژوازی کا مصلح ہو گا۔ یہ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں پروٹسٹنٹ فرقہ کیسے وجود میں آیا۔ برطانیہ کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کی ضرورتوں نے اس فرقے کو جنم دیا۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ لوگ اس طبقے کو تجارت کے لیے سُود پر روپیہ دیں تاکہ یہ طبقہ بڑے پیمانے پر دوسرے ممالک میں تجارت کر سکے یہی وہ دور تھا جب ہندوستان اور امریکہ یورپ والوں کو دریافت ہوئے تھے اور بحری راستے کھلے تھے اور شراکتی کمپنیاں وجود میں آرہی تھیں اور ان کے حصص فروخت ہونے لگے تھے

اسی طرح ہمارے ہاں سرسید کا مکتب فکر ہی تھا جس نے سود کے جواز کے حق میں آواز اٹھائی یہی وہ دور تھا جب نئی ضرورتوں کی یلغار شروع ہوئی تھی یہی وہ دور تھا جب انگریزی تعلیم کی ضرورت شروع ہوئی اور مغربی علوم کی یلغار جو دراصل ایک نئی معیشت، ایک سرمایہ دارانہ معیشت کی یلغار تھی جس نے جاگیرداری طرز زندگی کو پچھاڑنا شروع کر دیا تو سرسید نے کئی مورچے باندھنے کے حق میں آواز اٹھائی اور اسلام کو نئی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان

کی تفسیر، ان کی تحریریں اسی ضرورت کو پورا کرتی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیائے اسلام میں مغربی علوم کی عقلیت پسندی نے تہلکہ مچادیا تھا اور جگہ جگہ نئے مفکر پیدا ہورہے تھے۔ جو نئی ضرورتوں کے تحت اسلام کو ہم آہنگ کررہے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ اسلامی تحریکیں سامراج کے خلاف جدوجہد کا بھی مظہر بن رہی تھیں کیونکہ ان تمام تحریکوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ مغربی استعمار سے گلوخلاصی، مغرب کے علوم جانے اور اسلام کو ان سے ہم آہنگ کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔

اور آج بھی تو یہی عمل جاری ہے۔ جمال عبدالناصر کی عرب قوم پرستی اور سوشلزم یا بعث پارٹی کی جو تحریکیں ہیں یا پھر خود مشرق وسطیٰ میں مارکسی تحریکیں ان ضرورتوں کو پورا کررہی ہیں یہ درست ہے کہ ان تحریکوں کی مزاحمت بھی ہورہی ہے۔ لیکن یہ مزاحمت، یہ جدل ایک قدرتی امر ہے۔ اسی طرح وہ وقت بھی آئے گا جب حج کے یہ NORMS بھی بدل جائیں گے ایک وقت تھا اونٹ پر بیٹھ کر مدینے جانا سنت تصور ہوتا تھا۔ لیکن اب کوئی اس سنت کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا اب ٹیکسی اور موٹر اور بس یہ معمول ہیں اس طرح سے سینکڑوں معمولات ہیں جو کل تک رائج تھے۔ لیکن آج ان میں زبردست تبدیلیاں آگئی ہیں خود حرم کی توسیع کو لیجیے صفا اور مروہ کی اس میں ادغام یہ تمام وقت کی ضرورتیں ہیں۔

آج میں نے پہلی بار لاہور کا معمول شروع کیا اور ایک گھنٹہ سیر کی ہے۔ یہ سیر خود حرم شریف کی اُوپر کی چھت کے پانچ چکر تھے ہر چکر تقریباً پندرہ سولہ منٹ کا تھا اس طرح سے تقریباً ساڑھے چار یا پانچ میل بنے ایک دو دن میں وہی سات آٹھ میل مکمل کرلیا کروں گا۔

میں جہاں بیٹھ کر اس وقت یہ سطور لکھ رہا ہوں یہاں سے حجر اسود کوئی دس گز کے فاصلے پر ہوگا اور میرے سامنے کبوتر دانہ کھا رہے ہیں لوگ آتے ہیں اور دانہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ عام معمول ہے۔ یہ کبوتروں سے محبت اور ان کو اس طرح دانہ ڈالنا یہ بھی تمام مذاہب اور ادیان میں غالباً مشترکہ ہے۔ تاریخی گرجوں میں بھی یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور خود ٹرافالگر سکوئر TRAFALGAR SQUARE میں یہی حال ہے کہ وہاں پر کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہیں

پیار کرتے ہیں کندھوں پر بٹھاتے ہیں۔

اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد اور بیت اللہ شریف کے دس طواف مکمل کر کے ہم باہر نکلے اس وقت لوگ ناشتے کے لیے ہوٹلوں کا رخ کر رہے ہیں یا پھر خرید و فروخت میں مصروف تھے چنانچہ ہم نے ایک نان خریدا۔ آدھ سیر سیب خریدے اور گھر آتے یہاں آکر چائے بنائی اور نان مکھن جام کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ایک ایک سیب کھایا اس کے بعد کمرے کی صفائی کی ترکاری بنائی۔ برتن صاف کیے۔ عائشہ نے کھانا پکانا شروع کیا اور میں نے اتنے میں غسل کیا اور شیو کی۔ اس کے بعد عائشہ نہائی۔ اور ہم تیار ہو کے باہر نکلے۔ اس دوران میں کوثر افتخار اور تسنیم سب کو خط لکھے رانی کو بھی خط لکھا۔ ڈاک خانے گئے۔ اس کے بعد حرم شریف میں نماز ظہر با جماعت ادا کی اور اب یہاں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں عصر کی جماعت کا انتظار ہے اس کے بعد جا کے کھانا کھائیں گے۔

مغرب کی نماز ادا کر لی ہے۔ عصر کے بعد ہم گھر گئے۔ راستے سے تندوری نان لے گئے اور کھانا کھایا۔ چائے پی اور یہاں حرم شریف میں واپس آ گئے۔ اب اس روزنامچے میں بوریت ہونی شروع ہو گئی ہے۔ اب تک یہ صفحات لکھ کر دل بہلاتا رہا ہوں اور وقت کٹتا رہا ہے اب لکھنے کو مزید کچھ نہیں رہا۔ اگر یہاں پڑھنے کو کچھ مل جاتا تو لکھنے میں بھی آسانی ہوتی یہاں پردیسے بھی دنیا سے بالکل لاتعلق ہوں۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ حج کو کوئی جب آتا ہے تو گھر بار کی یاد سے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب تک تو یہی کیفیت رہی آگے دیکھیے کیا کیفیت ہوتی ہے۔

یکم جنوری

نیا سال طلوع ہو گیا۔ رات نہ کوئی ہنگامہ، نہ یاروں کی محفل، نہ میکدوں کی دھکم پیل نہ نصف شب کو چراغ گل ہوتے، نہ مہ وشوں سے چمٹنے کا لطف آیا۔ نہ فضا معطر ہوئی، یہ نئے سال

کی رات بالکل خاموشی سے گزر گئی اور ہم معمول کے مطابق تہجد ادا کرنے کے لیے علی الصبح اُٹھے چائے بنائی اور پی کر وضو کر کے حرم شریف پہنچے یہاں آکر میں نے تہجد کی دو رکعتیں ادا کیں اس کے بعد قرآن شریف ترجمے والا موجود تھا وہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی اس کے بعد صبح کی نماز کی اذان ہوئی وہ باجماعت ادا کی۔ آج ہوا میں قدرے زیادہ خنکی تھی اور سردی لگ رہی تھی۔ میرے پاس گرم چادر تھی اس سے سردی سے محفوظ رہا۔ نماز کے بعد میں نے معمول کے مطابق ایک گھنٹہ تک حرم شریف کے چھ سات چکر لگائے اور تقریباً تین ساڑھے تین میل کی اس طرح سیر ہوگئی۔ لیکن یہاں ہم تمام دن جتنے چکر کاٹتے ہیں اور آتے جاتے ہیں اس سے بھی تین چار میل کی مسافت تو ہو جاتی ہے آج میں نے گھڑی سعودی عرب کے وقت کے مطابق کر لی ہے اس گھڑی کے مطابق صبح کی نماز بارہ بجے ہوتی ہے۔ ہم حرم شریف سے کوئی ڈیڑھ بجے نکلے راستے میں ناشتہ کا سامان لیا اور گھر جاکر ناشتہ بنایا اور کیا۔ اس کے بعد میں نے روپے ریال میں تبدیل کروائے اور فی الحال مکان کے کرائے اور دوسرے واجبات میں سے جو سترہ سو ریال بنتے تھے ایک ہزار ریال ادا کر دیے باقی کے ایک ہفتہ میں ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے بعد مفتی ضیاء الحسن کا چھوٹا بھائی مفتی وارث مل گیا اس کے ساتھ پاکستان کے اخبارات دیکھنے گیا کوئی خاص خبر نہ تھی۔ گھر آیا عائشہ کپڑے دھو رہی تھی اور دال بھی اس نے بنالی۔ اب نہا دھو کر شیو کر کے ظہر کی نماز کے لیے حرم شریف میں آتے ہیں۔ اس وقت پونے سات بجے ہیں۔ سات بجے ظہر کی نماز ہوتی ہے۔

عصر کے بعد میں عائشہ کی تلاش اور انتظار میں مروہ کی پہاڑی پر بیٹھا عقیدت مندوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھ رہا ہوں روزانہ میں اس منظر سے مسحور ہو جاتا ہوں۔ احرام باندھے سینکڑوں ہزاروں مرد اور خواتین پرندوں کے غول در غول کی مانند بلند آواز سے آیات پڑھتے آتے ہیں اور یہاں مروہ کی پہاڑی کی طرف پشت کر کے کعبہ کو سلام کرتے ہیں اور پھر چکروں اور طوافوں میں مشغول ہو جاتے ہیں کچھ مرد اور عورتیں تیزی کے ساتھ اس ٹیڑھی میڑھی کھردرے پتھروں والی پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کئی ایک گر جاتے ہیں اور کئی ایک چڑھ جاتے ہیں بہر حال عقیدت

اور شیفتگی کا ایک مسحور کن منظر ہے۔
میں خوش ہوں کہ یہ تجربہ بھی کر لیا۔ یہ ایک انوکھا اور بے مثال تجربہ ہے۔ ہر لحاظ سے یہ بے مثال ہے کروڑوں انسانوں کی یہ شیفتگی، یہ عقیدت، یہ والہانہ پن ایک دفعہ تو یہ تمام جذبے انسان کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔
مجھے یہاں مروہ کی پہاڑی پر بیٹھ کر احساس ستاتا اور یہ سوال پریشان کرتا کہ کیا دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اپنے ماضی کو جاننے کے لیے ان مقامات پر آنا ضروری ہے یا نہیں؛ لیکن خود ہی جواب دیتا ہوں کہ اگر دنیا بھر میں انگریزی پڑھے لکھے یا ویسے ادب سے دلچسپی رکھنے والے مرد یا عورت کے لیے شیکسپیئر کا مکان دیکھنا ایک حد تک روایت بن گیا ہے یا نہیں، بہرحال ایک گونہ اہمیت ہے اسی طرح اسلام سے متعلق لوگوں کے لیے یہ مقامات ایک گونہ اہمیت رکھتے ہیں یہ ان کے ماضی کا حصہ ہیں ان کی تہذیب کے امین ہیں ان کی روایات کے سوتے یہاں سے یہاں کسی نہ کسی حد تک پھوٹتے ہیں باقی ہر مذہب اور ہر تہذیب کی اپنی دیو مالا ہوتی ہے اسلام کی بہت سی عبادات اسی عرب دیو مالا کا حصہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس دیو مالا کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور چونکہ اسلام بھی سامی مذہب ہے اس لیے سام کی تاریخ اس کی بھی تاریخ ہے۔
خدا بھلا کرے سبطِ حسن کا اس نے ان پرانی تہذیبوں پر کام کر کے ہمارے علم میں بہت زیادہ اضافہ کیا چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ "اللہ" مکے والوں کے سب سے بڑے بت کا نام اللہ ہی تھا۔ حجاز میں مکے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ شہر وہاں کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا مکے میں ہر سال بہت بڑا ایک میلہ لگتا تھا۔ جسے سوق العکاظ کہتے تھے، شہر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہاں خانہ کعبہ واقع تھا۔ یہ جگہ عربوں کی سب سے بڑی مقدس عبادت گاہ تھی جہاں وہ ذی الحج کے مہینے میں حج کی رسم منانے آتے تھے۔ حرم کے پاسبان زائرین سے حج کا محصول وصول کیا کرتے تھے اسی لیے کعبے کی پاسبانی کے لیے مکہ والوں میں اکثر رسہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ عبدالمناف اور ان کے بیٹے ہاشم کی دولت و ثروت کا ایک سبب حرم کی پاسبانی کا عہدہ بھی تھا اور جب ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب نے چاہِ زمزم کو جو ریت کے نیچے مدت سے دبا پڑا

تھا کھود نکالا تو بنی ہاشم کا اثر اور بڑھ گیا۔ (ابن اسحاق سیرۃ الرسولؐ) مکے کا سب سے بڑا اور طاقتور قبیلہ قریش کا تھا چنانچہ شہر کا نظم ونسق اسی قبیلے کے ہاتھ میں تھا۔

حجاز میں عقائد کے اعتبار سے پانچ قسم کے لوگ آباد تھے۔ اول مشرکین جو اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو بھی مانتے تھے اور ان کے بتوں کی پرستش کرتے تھے دوسرے کفار جو اللہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے قبائلی یا خاندانی دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتے تھے تیسرے یہودی جو حجاز کے قدیم باشندے نہ تھے بلکہ سلطنت روما نے جب فلسطین پر قبضہ کیا تو وہاں سے بھاگ کر حجاز میں آباد ہو گئے تھے یہ لوگ یمن اور شام کے تجارتی راستے پر واقع چھوٹے چھوٹے نخلستانوں میں رہتے تھے ان کا پیشہ زراعت تھا انھوں نے عربوں کی زبان اختیار کر لی تھی مگر وہ عربوں سے الگ تھلگ رہتے تھے وہ اپنی مقدس کتابیں بھی ہمراہ لاتے تھے اور اہل کتاب ہونے پر فخر کرتے تھے یہودی اپنے خدائے واحد یہوہ کی عبادت کرتے تھے اور عام عربوں کو جو صنم پرست تھے بہت حقیر سمجھتے تھے یثرب پر یہودیوں ہی کا غلبہ تھا۔ چنانچہ ان کے دو قبیلے عوس اور خزرج وہاں بڑے بااثر تھے۔

چوتھا گروہ نصارٰی کا تھا مگر ان کی آبادی بہت کم تھی اور ان کے اکثر رہنما علائق دنیاوی سے دور صحراؤں اور غاروں میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

پانچواں گروہ وہ تھا جسے اہل مکہ حنیف کہتے تھے یہ لوگ فقط اللہ کی عبادت کرتے تھے اور مکے کے دوسرے خداؤں کو نہ مانتے تھے۔ امیہ ابن ابی السلط جو آنحضرتؐ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے۔ اور ورقہ بن نوفل جو حضرت خدیجۃ الکبرٰی کے چچازاد بھائی تھے حنیف ہی تھے۔

مکہ بلکہ پورے حجاز میں غالب اکثریت مشرکین کی تھی وہ بکثرت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا معبود اللہ تھا۔

الاولی، ام الجمال، صنعا اور یمن کے آثار قدیمہ میں ایسے قدیم پتھر برآمد ہوتے ہیں جن پر اللہ کا نام کندہ ہے۔ ان میں بعض پتھر پانچویں صدی قبل مسیح کے ہیں اور بعض رسولؐ مقبول کی ولادت

سے پانچ سو سال قبل کے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب میں اللہ کی عبادت کا رواج بہت مدت سے تھا۔

مفسرین میں لفظ اللہ کے مخرج و معنی کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن بیضاوی (وفات ۱۲۸۶ء) کا خیال ہے کہ اللہ دراصل اَل اِلٰہ ہی کا اختصار ہے جو ابتداء میں اسم نکرہ کے طور پر مستعمل تھا۔ لیکن بعد میں اسم معرفہ بن گیا۔ قرآن نے بھی الٰہ کی اصطلاح عام خداؤں کے معنی میں استعمال کی ہے اور اسے اسمِ معرفہ بنانے وقت واحد کا اضافہ کر دیا ہے۔

ائنکم تشھدون، ان مع اللہ الھۃ اخری قل لا اشھد،

قل انما ھو الہ واحد و انني بری مما تشرکون۝

ترجمہ "کیا تم سچ مچ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں تو کہہ میں گواہی نہیں دیتا۔ تو کہہ وہی ہے معبود ایک اور بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں"

الٰہ تمام سامی قوموں میں خدا کا نام تھا۔ عکادی اور کنعانی زبانوں میں اسے ایل کہتے تھے چنانچہ کنعانی نوشتوں اِل (EL) کو بار بار "تمام مخلوقات کا خالق" کہا گیا ہے (ANET – 143) یہودیوں کے مذہب میں وہ الوہیم قرار پایا اور عربوں نے اسے الٰہ اور اللہ کہہ کر پکارا۔

قرآن میں اہل مکہ کی اللہ پرستی کے جابجا اشارے ملتے ہیں مثلاً سورۃ یونس ۲۲ میں لکھا ہے کہ وہ خطرے کے وقت اللہ سے دعا مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر تو ہمیں آندھی اور طوفان سے نجات دلوائے گا تو ہم تیرا شکر ادا کریں گے۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسلام اور عربوں کی تاریخ کا مطالعہ عام ہو تو جو اسلام کے ساتھ اب بہت سی غیر عقلی اور غیر منطقی باتیں منسوب ہو گئی ہیں یا کر دی گئی ہیں تو ان کو سمجھنے میں بہت ہی

آسانی ہوگی اور یہ سمجھا جا سکے گا کہ کون سی عبادت اور روایت عربوں کی کس ضرورت کو پورا کرتی رہی ہے اور کیا یہ عبادت اور یہ روایت غیر عربوں کے لیے بھی ضروری ہے اور سب سے بڑی بات خود اسلام بحیثیت تحریک کے اس زمانے کے کن سماجی عوامل کی پیداوار تھا اور کن تقاضوں کی تکمیل کے خواہش مندوں نے اس تحریک کو اپنایا۔

۲ر جنوری

آج تہجد سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھ بیٹھے۔ دراصل یہاں زندگی ہر وقت متحرک رہتی ہے اور پوری رات سڑکوں پر ہجوم رواں دواں رہتا ہے۔ شور شرابہ، ٹیکسیوں، کاروں اور بسوں کی آمد و رفت ان کے ہارن کی گونج سونے نہیں دیتی۔ یہاں پر اچھے کمروں کی نشانی یہ ہے کہ وہ حرم کے بالکل قریب ہو، لب سڑک ہو گا تو پھر سونا محال ہو گا۔ چنانچہ یہی حال ہمارا ہے۔ آج تہجد کی اذان سے بھی پہلے حرم شریف میں پہنچ گئے۔ آج میں نے حرم کے سات چکر لگائے اور دعائیں مانگیں اس کے بعد معمول کے مطابق ناشتہ کا سامان لیا اور گھر آ گئے۔ اتنے میں مفتی وارث نے کہا کہ اگر منیٰ اور عرفات چلنا ہے تو ایک پارٹی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ سطور جبل نور کی مسجد میں بیٹھا لکھ رہا ہوں راستے میں غار ثور بھی دیکھی اور واپسی میں ان تین شیطانوں کے مجسمے دیکھے جن پر حج کے موقعہ پر کنکریاں مارتے ہیں۔

آخر یہ سب کیا ہے؟ دیو مالا نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ دیو مالا۔ یہ اللہ اور اس کے شیطان۔ محبت اور نفرت کے ازلی مظہر ہیں۔ ان میں ڈر بھی ہے اور خوف بھی۔ رحم بھی ہے اور مہربانی بھی۔ غرضیکہ خدا کے تمام وہ اوصاف پوشیدہ ہیں جو انسانوں کے اندر کے جذبے ہیں۔

۳/ جنوری

وہی نماز فجر کے بعد حرم شریف میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں کل دوپہر سے یہاں شدید آندھی چل رہی ہے اور برفانی ہوائیں جسم کو چیر رہی ہیں رات بھر آندھی کی وجہ سے ایک عجیب و غریب وحشتناک شور رہا ہے۔ یہاں تمام پرانے مکانات میں لکڑی بہت زیادہ استعمال کی گئی ہے اور کھڑکیوں کے چوکھٹوں کے اندر شیشے یا تختے نہیں ہیں بلکہ چلپٹیاں ہیں اور ان کو ہوا کے لیے اُوپر نیچے کیا جاسکتا ہے لیکن اب یہ اتنی خستہ ہوگئی ہیں کہ وہ بند ہی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ رات ان چپٹیوں کی وجہ سے شور ہوتا رہا اور ہوا کے تھپیڑے آتے رہے۔ حرم شریف میں بھی آج ہر ایک نے ستونوں کی پناہ لینے کی کوشش کی لیکن یہ خنک ہوا اتنی تیز تھی کہ اس سے کسی کو پناہ نہ مل سکی۔ ہمارے پاس گرم کپڑے اتنے تھے کہ اس سردی سے محفوظ رہے۔ آج بھی میں نے معمول کے مطابق حرم کے چھ سات چکر لگائے اور وہ سیر کی عادت پوری کرلی کل شام کو میں نے دو پراٹھے بازار سے لاکر کھالیے بھوک زیادہ تھی ویسے بھی دال اور پراٹھے بہت لذیذ تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات بدہضمی کا شکار رہا اور پوری رات ڈکار آتے رہے اس وقت بھی پیٹ بوجھل ہے۔ ویسے کل اجابت بھی نہیں ہوئی۔ اس وقت زیادہ بھوک بھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ کھانا کھائے تقریباً سولہ گھنٹے سے زیادہ ہی گزر گئے ہیں۔

۴/ جنوری

آج بھی معمول کے مطابق تہجد سے پہلے اٹھ بیٹھے اور تیار ہوکر چائے بنائی۔ چائے پی کر حرم شریف روانہ ہوئے وہاں پہنچے تو تہجد کی اذان ہوئی۔ رات بھی خنک ہوا چلتی رہی اور مخلوق صبح

کو حرم میں بھٹر رہی تھی۔ ہر کوئی ستونوں کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ چنانچہ ہم بھی ایک ستون کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئے ویسے گرم کپڑے کافی تھے۔ آج میں صرف دو چکر ہی لگا سکا یہ چکر بھی تہجد اور صبح کی اذان کے درمیان لگائے۔ خیال تھا کہ باقی چکر نماز کے بعد لگاؤں گا لیکن نماز کے بعد عائشہ کو زیادہ سردی محسوس ہونے لگی اور ہم واپس آگئے۔ آکے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد عائشہ سو گئی اور میں کالا باغ سے متعلق لکھتا رہا۔ آج دس صفحے لکھ لیے اس طرح سے یہاں پر میں نے تین چیزیں شروع کر رکھی ہیں۔ اولاً تو یہ روزنامچہ ہے دوئم اپنی سوانح سوئم یہ کالاباغ سے متعلق کتاب ہے میں تو یہاں بھی یہی دعا مانگتا ہوں کہ اے اللہ مجھے لکھنے پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ انشاء اللہ العزیز یہاں سے واپسی پر کافی کام کر چکا ہوں گا۔ کالا باغ سے متعلق تفصیلی کام بھی کر لوں گا۔ صرف اقتباسات کا اندراج یا حوالہ جات کا کام باقی رہ جائے گا وہ لاہور جا کر کر لوں گا۔

اس کے بعد میں یہاں پاکستان کے شفاخانہ اور حج آفس میں گیا وہاں جا کر اخبارات دیکھے یہ ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کے اخبارات تھے وہاں ہزاروں کا ہجوم تھا۔ کوئی پہلے جانا چاہتا تھا کسی کا سامان کھو گیا تھا۔ کسی کو عزیز کی تلاش تھی۔ کسی پر ڈاکٹر توجہ نہیں دیتے تھے غرضیکہ بیچارہ ایک نوجوان وہاں پر سب کو بھگتا رہا تھا۔ بھگتنا کیا تھا ٹالنے کا کام تھا۔ سو وہ کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔

یہاں مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے اور یہاں دکاندار حاجی کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں اور پہلے چائے کی پیالی چار قرش کی تھی پھر دیکھتے دیکھتے چھ قرش کی ہوئی اور پھر آٹھ کی۔ آج کوکاکولا نصف ریال کی ہو گئی ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے دام دوگنا تین گنا ہوتے جا رہے ہیں اور تو اور حاجیوں کو دال وغیرہ نصف کلو سے کم فروخت ہی نہیں کرتے عرب کوئی آتے تو وہ خواہ آدھ پاؤ خریدے لیکن حاجی کو نصف کلو خریدنے پر مجبور کریں گے۔

۵/ جنوری

آج جمعہ کا دن ہے وہی معمول کے مطابق حرم شریف میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں اب تمام شور شرابے اور رات بھر کے ہنگاموں کے باوجود نیند اتنی آجاتی ہے کہ آج صبح تہجد کی اذان سن کر آنکھ کھلی ورنہ اب تک میں تہجد سے پہلے ہی اٹھ بیٹھتا تھا اور پھر عائشہ کو جگاتا تھا لیکن آج حرم میں پہنچتے پہنچتے کچھ دیر ہوگئی پھر بھی فجر کی اذان سے بہت پہلے پہنچ گئے اور تہجد ادا کرلی۔ ہجوم بڑھتا ہی چلا جارہا ہے اب نیچے تو ہم کئی دنوں سے نہیں گئے تھے۔ حرم کی اوپر کی چھت پر ہی تمام دن گزارتے ہیں یہاں اب بھی جگہ مل جاتی ہے اور جگہ کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے ورنہ نیچے تو جسے کہتے ہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں وہ حال ہے۔

آج سے پورے آٹھ دن بعد یعنی آٹھ دن بعد جمعہ کو حج کی تقریبات شروع ہوں گی۔ اور اسی دن ہم جمعہ کو اشراق کی نماز کے بعد یعنی سورج کے طلوع ہونے کے بعد منیٰ کو روانہ ہوں گے اور پھر پانچ دن بھاگ دوڑ کا وہ سلسلہ ہوگا کہ الحفیظ والامان۔ بس اس فریضہ سے بھی اللہ تعالیٰ احسن طریقے سے گزار دے اور پوری تندرستی اور توانائی کے ساتھ سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ ابھی تک پاکستان سے کوئی خط نہیں آیا۔ ہم نے فقط دو خط لکھے ہیں۔

جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے حرم میں داخل ہوئے ہیں لیکن تقریباً نصف دروازوں سے واپس لوٹ آتے ہیں اس لیے کہ جگہ نہیں تھی۔ نمازی مرد اور عورتیں حرم سے باہر سڑک کے کنارے پٹڑیوں پر بھی بیٹھے ہیں بالآخر خدا خدا کرکے تہہ خانے میں جگہ مل گئی ہے اور یہیں یہ سطور لکھ رہا ہوں ہیں اور عائشہ ابھی ابھی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ یہاں کی خلقت، ان کی وارفتگی، شیفتگی اور ہجوم کا نظارہ الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتا اس کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہ دوسرا

جمعہ ہے پہلے جمعہ کو اتنا ہجوم نہیں تھا لیکن آج حرم کی دو منزلیں اور تہہ خانے پُر ہیں اور پھر نمازی ہیں کہ باہر سڑکوں پر بیٹھے ہیں یہ اس وقت ہے جب کہ ابھی اذان بھی نہیں ہوئی - اور اذان ہونے میں ابھی پون گھنٹہ باقی ہے۔ نمازی ہیں کہ فوج در فوج چلے آرہے ہیں دراصل آج کے دن پورا حجاز قریب قریب اُمڈا آرہا ہے اس لیے کہ حج کے مہینے کا پہلا جمعہ ہے ویسے بھی حرم میں نماز کا ادا کرنا فضیلت تصور ہوتا ہے بہرحال انسانوں کی تعداد کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا ویسے اتنے بڑے اجتماع کے سنبھالنے کا کام خاصا مشکل کام ہے۔ گو سعودی حکومت بہت حد تک کامیابی سے یہ فریضہ انجام دیتی ہے لیکن سعودی عرب حکومت کو چاہیے کہ وہ تمام ممالک کا کوٹہ مقرر کر دے اور کوٹہ اس تعداد کے مطابق ہو جتنے لوگوں کے ٹھہرانے کا وہ معقول انتظام کر سکے اور حج کی تقریبات آسانی سے ادا کی جاسکیں۔ کیونکہ اگر یہاں سکون نہ ملے تو عبادت نہیں ہو سکے گی اور جس مقصد کے لیے حجاج آتے ہیں وہ فوت ہو جائیگا۔

رات شام کی نماز کے بعد میں حرم کا چکر لگانے کے لیے اپنی جگہ سے چلا تو راستے میں پیر احسن الدین پر میری نگاہ پڑی وہ بھی مجھے دیکھتے رہے میں نے ان کو دیکھا بالآخر ان سے پوچھ لیا کہ پیر احسن الدین ہیں؟ لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکے پھر میں نے نام لیا تو لپٹ گئے۔ اب وہ یونائیٹڈ نیشنز کے شعبۂ خوراک سے ریٹائر ہوگئے ہیں ویسے تو ہر سال حج کو آتے ہیں بہت مذہبی ہوگئے ہیں پہلے بھی خاصے تھے لیکن اب تو فراغت بھی زیادہ ہے ان سے کافی دیر گپ ہوتی رہی تاآنکہ عشاء کی اذان ہوگئی ویسے باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ جون ۱۹۷۱ء میں ایم ایم احمد یحییٰ کے خاص ایلچی کے طور پر نکسن سے ملے تھے اور انھوں نے آئین کا وہ مسودہ دکھایا تھا جس میں مجیب کے چھ نکات قریب قریب INCORPORATE تھے اور عوامی لیگ سے سیاسی تصفیہ کا بھی وعدہ کیا امریکہ اس یقین دہانی پر خاصا مطمئن تھا۔ لیکن بعد میں کیا ہوا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعد میں یحییٰ کیوں منحرف ہوگئے۔ ویسے پیر کا کہنا تھا کہ اس کے کئی ایک

جنرل کسی طاقت نے خرید لیے تھے جو مشرقی پاکستان سے کسی قسم کے سیاسی سمجھوتے کے امکانات کو ختم کرنے کے درپے تھے۔

۶/ جنوری

وہی معمول ہے فجر کی نماز ہو چکی ہے۔ آج رات سو ہی نہیں سکے اس لیے کہ شور بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور اب تو ہماری اپنی بلڈنگ میں اتنا شور ہونا شروع ہو گیا ہے کہ رات کو کئی بار نیند اچاٹ ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تہجد ہونے والی ہے۔ میں سعودی عرب کے ساڑھے دس بجے اٹھ بیٹھا۔ گیارہ بجے تہجد کی اذان ہوتی ہے اٹھ کر چائے بنائی پھر عائشہ کو جگایا۔ چائے پی کر گیارہ بجے حرم کے لیے روانہ ہوتے یہاں آکر تہجد پڑھی پھر اس کے بعد میں نے ۳۵ منٹ سیر کی، پھر فجر کی اذان ہو گئی۔ اس کے بعد نماز ادا کی۔ اب پون بجا ہے گھر کو روانہ ہوتے اس لیے کہ عائشہ کچھ مضمحل ہے اس کو دراصل کئی دن سے اجابت نہیں ہوئی قبض کی شکایت یہاں عام ہے گھر جا کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد ڈاک دیکھنے گئے ابھی تک لاہور سے ہمیں کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ اس کے بعد اخبار پڑھنے گئے اور اب پھر حرم شریف میں آگئے ہیں۔ دراصل باہر اس قدر شور ہوتا ہے جس سے سکون غارت ہو جاتا ہے اور گھر پر بھی شور چین نہیں لینے دیتا۔ اس کے مقابلے میں حرم شریف میں بہت آرام محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر پورا وقت ہی حرم میں گزارتے ہیں۔ بلکہ بہت سے حاجی تو گھر سے کھانا پکا کر یہاں لے آتے ہیں۔ اور جب بھوک لگتی ہے تو کھا لیتے ہیں۔

۷/ جنوری

اگر یہ روزنامچہ نہ لکھتا تو مجھے نہ دن کا احساس رہتا نہ تاریخ کا اب بھی بھول جاتا ہوں اور دن کے متعلق بھی اس طرح یاد رکھتا ہوں کہ جمعہ گزرے اتنے دن ہو گئے ہیں اس لیے آج غالباً یہ دن ہو گا ویسے یہ ایک نئی دنیا ہے جہاں آ کر بعض دفعہ بے حد مسرت ہوتی ہے اور بعض دفعہ چڑچڑاہٹ اور غصہ آتا ہے کہ اس دھکم پیل میں کیوں آئے۔ یہ میری کیفیت ہی نہیں بلکہ میری کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے میں سمجھتا ہوں کہ آنے کا فیصلہ بالکل درست اور بروقت تھا۔ یہ فریضہ ایک نہ ایک دن پورا کرنا تھا۔ ورنہ عائشہ کے ضمیر میں اس فریضے کی ادائیگی کے بغیر ایک خلش رہتی لیکن یہ غصے اور چڑچڑاہٹ کی کیفیت اس پر زیادہ طاری ہو رہی ہے اس کی وجہ واضح ہے کہ وہ یہاں کی صعوبتوں اور دھکم پیل اور مہنگائی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی اس نے سن رکھا تھا اور لوگ اس کو ڈراتے بھی تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں بیٹھ کر ان صعوبتوں، اس دھکم پیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا یہ پچھلے دو تین دن سے ہی جو ہجوم میں اضافہ ہوا ہے وہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے جس دھکم پیل کی ضرورت ہے عائشہ اس کے لیے بنی ہی نہیں ہے اس کا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ رنگ اس کا زرد ہو جاتا ہے اس کے طور اطوار بگڑنے لگتے ہیں۔ پھر یہی نہیں رات کو شور اور ہنگامے کی وجہ سے نیند پوری نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کہ صبح تہجد کے وقت جب اٹھتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے آج بھی عائشہ کو تکلیف تھی پہلے اس کا حرم شریف نہ آنے کا ارادہ تھا لیکن جب میں نے چائے بنا کر دی اور میں نے اکیلے آنے کا فیصلہ کیا تو وہ بھی تیار ہو گئی۔ لیکن مسجد میں داخل ہونے میں جو تکلیف ہوتی اس نے پھر اس کو پریشان کر دیا۔ اب یہ ایسی مصیبت ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور جیسے جیسے حج کے دن قریب آ رہے ہیں تو خوف اور وحشت سے دل

گھبرانے لگا ہے اس لیے کہ وہاں کے کم از کم تین دن کی جو کیفیت ہے اس کی روئیداد سن کر تو بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہونے لگتا ہے ایسے میں عائشہ کی کیفیت کا میں اندازہ کر سکتا ہوں وہ بے چاری کھل کر اس خوف و پریشانی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی اور اندر ہی اندر گھل رہی ہے جس کا اظہار کبھی سر درد اور کبھی پیٹ درد کی صورت میں ہونے لگتا ہے۔

ویسے میں اس ہجوم کو دیکھ کر اس طریق حج کے اور بھی خلاف ہو گیا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر اکثر ایسے لوگ ہیں جو محسوس کرتے ہیں کہ حج کی یہی صورت رہی تو بہت جلد اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اب یہاں خاصی تعداد میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو فقط سیر و تفریح کے لیے یہاں آتے ہیں اور عبادت مقصود اور منتہائے نظر نہیں پورا پورا خاندان دودھ پیتے بچے تک آتے ہیں۔ یہ صورت تمام ممالک سے ہے۔

یہاں کے اخبارات میں آیا ہے کہ اس دفعہ تمام ممالک سے حاجیوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے پہلے میرا یہ خیال تھا کہ اس دفعہ صرف پاکستان سے ہی حاجیوں کی اتنی بڑی تعداد کو بھیجا گیا ہے اور اس سے سیاسی مقاصد حاصل کرنے مقصود ہیں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اگر اسّی ہزار یا ایک لاکھ افراد کو حج کا موقعہ دیا جاتا ہے تو حکومت ایک کثیر آبادی کی ہمدردیاں حاصل کر سکتی ہے لیکن مصیبت یہ ہوتی ہے کہ کاغذ پر تو یہ منصوبہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن ایک لاکھ افراد کو حج کرانے کے لیے جن سہولتوں کی ضرورت ہے اس کے لیے پیسہ تو چاہیے اور وہ حکومت مہیا بھی کر رہی ہے لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس تنظیم کی ہے جو ان ایک لاکھ افراد کے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے انتظامات مکمل کرے اب وہ تنظیم غائب ہے اس کے بعد یہاں سعودی عرب کی حکومت، معلم، مہنگائی اس پر مستزاد ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک لاکھ حاجی حکومت کے شکر گزار ہوں۔ وہ نکتہ چیں بن جاتے ہیں۔ اس لیے اس وقت ضرورت ہے کہ حج کے پورے طریق کار کے بارے میں غور کیا جائے اور عوام کی اس ضمن میں تربیت کے لیے بھرپور مہم چلائی جائے ورنہ لوگ بددل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اب عائشہ کو اگر کوئی مفت حج پر جانے کے لیے بھی کہے تو وہ ان حالات

کے ہوتے ہوتے کبھی نہیں آئے گی یہ حالت اس کی ہی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں کی اس وقت یہی کیفیت ہے۔

اس وقت دوپہر ہو رہی ہے ظہر کی نماز میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے ابھی ابھی یہ پنسل بازار سے نصف ریال کی لایا ہوں، وہاں اسکی بصد مشکل قیمت یہی کوئی چھ آٹھ آنے ہوگی REFIL درکار تھا وہ ملا ہی نہیں اس لیے میں یہی لے آیا ہوں تاکہ کام تو چلتا رہے۔

عائشہ سالن پکا کر اب سو رہی ہے کمرے کی صفائی کی ناشتہ کیا۔ بازار سے سودا سلف حرم سے واپسی پر ہی لے آئے تھے۔ میں نہایا ہوں۔ شیو کی ہے۔ پھر بازار سے صابن لایا ہوں۔ ڈاک دیکھ کر آیا ہوں۔ لاہور سے کوئی خط نہیں آیا کوئی زیادہ پریشانی نہیں بہرحال خیال تو آتا ہے۔

عائشہ پر حج کے سلسلے میں زبردست پست ہمتی چھائی ہوتی ہے۔ ہمسائے میں ایک عورت مقیم ہے جو تین حج کر چکی ہے۔ پاکپتن کے قریب کا کوئی کھاتا پیتا زمیندار گھرانہ ہے انھوں نے بتایا ہے کہ شیطان کو کنکریاں مارتے وقت سخت ہجوم ہوتا ہے اور یہی سب سے اہم فریضہ ہوتا ہے۔ اس وقت دھکم پیل سے کئی ایک زخمی اور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر عائشہ کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے ہیں میں اس کو تسلی دیتا ہوں کہ اب جو یہ انبوہ کثیر گھروں سے نکلا ہے تو جو اس کا حال ہو رہا ہے وہی ہمارا ہو گا۔

۸ جنوری

آج پیر کا دن ہے جیسے جیسے حج کی تقریبات قریب آ رہی ہیں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے اور بے قابو ہو رہا ہے اب نمازوں کے وقت حرم میں داخلہ بھی ناممکن ہو رہا ہے چنانچہ

اس وقت تہجد کی اذان ہو چکی ہے اور ہم نے اپنے کمرے میں ہی تہجد کے نوافل ادا کیے ہیں اور جیسے ہی فجر کی اذان ہو گی یہیں نماز بھی پڑھ لیں گے ویسے کمرہ ہمارا ایسی جگہ ہے جہاں سے باجماعت نماز ادا کی جا سکتی ہے

یہ ہجوم اور کاروں ٹیکسیوں کے ہارن تمام رات سونے نہیں دیتے۔ سڑک پر تمام رات آمد و رفت ایسے رہتی ہے جیسے دن کو ہوتی ہے یہاں ان دنوں میں دن اور رات کی تمیز ختم ہو جاتی ہے ابھی تو رات عشاء کے بعد حرم شریف خالی کرا لیا جاتا ہے ورنہ حاجی حضرات تو رات کو بھی وہیں ڈیرہ لگا لیا کریں اب بھی دلیس دلیس کے حاجی کوئی کم گندگی نہیں پھیلاتے یہ تو سعودی حکومت کی طرف سے حرم میں متعین کردہ خدام ہیں جو حکومت کے ڈر سے حرم کا خیال رکھتے ہیں اور ہر نماز کے بعد صفائی شروع کر دیتے ہیں وگرنہ یہ اہتمام نہ ہو تو یہ لوگ کعبۃ اللہ کی چادر بھی نوچ کر لے جائیں اور حرم کے در و دیوار پر لوگ اپنی منتیں اور نام کھودنا شروع کر دیں۔

بار بار یہ خیال آتا ہے کہ حج کے متعلق پڑھنے اور بذاتہ اس تجربے سے گزرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے شاذ ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جس کے باشندے یہاں موجود نہ ہوں۔ اکثر ممالک کے یہاں شفاخانے ہیں اور جن ممالک کے شفاخانے نہیں ہیں وہ اپنے سفری شفاخانے ان دنوں یہاں بھجواتے ہیں تاکہ ان کے باشندے جو حج کے لیے آئیں وہ بیمار ہو جائیں تو ان کا علاج ہو سکے۔ ہندوستان، پاکستان، مصر، شام وغیرہ کے باقاعدہ شفاخانے ہیں۔ اسی طرح ایران ترکی وغیرہ کے سفری شفاخانے یہاں حرم کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔

پاکستان سے آنے والے حاجیوں میں خاصی تعداد تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو پہلے حج کر چکے ہیں بلکہ ایک نہیں، دو، دو، تین تین حج کر چکے ہیں پھر آ رہے ہیں۔ ایسے بھی لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں جن کو حج کی اہمیت کا قطعاً علم نہیں صرف ذرائع ہیں یا وہ بھی مانگ تانگ کر آتے ہیں یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ مذہبی سطح پر تربیت کرے اور اب جبکہ اسلام سرکاری مذہب بنا لیا گیا ہے تو پھر حکومت کو صحیح اسلام بتانے کی ذمہ داری بھی قبول کرنی ہو گی۔ یہاں آ کے سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام

کا پرچار ایسے حکمرانوں کے دور میں کیوں زیادہ ہوتا ہے جو اپنی تربیت، اپنی تعلیم، اپنے انداز فکر میں سیکولر ہوتے ہیں۔ اس کی دراصل کئی ایک وجوہات ہیں۔ اولاً تو اسلام کا یا ان معنوں میں مذہب کا سہارا حکمران اس وقت لیتے ہیں جب ان کی سیاست یا تو شکست کھانے لگتی ہے یا ان کا سیاسی طور پر عوام سے رابطہ کٹنے لگتا ہے یا پھر عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانا مقصود ہوتا ہے اور ان کو مذہبی نعرے دے کر بہلایا جانا ضروری ہوتا ہے لیکن آج جو اسلام کا سہارا لیا جاتا ہے اس میں عالمی صورت حال کا بھی عمل ہے

ذوالفقار علی بھٹو پہلے حاکم ہیں جو ملکی اور عالمی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر پالیسیاں متعین کرتے ہیں ورنہ پاکستان میں اب تک جو حکومتیں رہی ہیں ان کو عالمی صورت حال پر کبھی پوری طرح عبور ہی نہیں ہوا۔ ایوب کی حکومت میں بھی خارجہ پالیسی میں جو وسعت آئی تو اس میں بھی بھٹو کی اپنی وسعتِ نظر اور عالمی حالات میں ہونے والی تبدیلیوں کے ادراک کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔

اب بھٹو نے تمام کامیابیاں اسلام پسندوں کو چاروں شانے چت کر کے حاصل کیں اس کے اور اس کے اسلامی سوشلزم کے خلاف فتوے صادر ہوئے۔ اس کو کافر ٹھہرایا گیا۔ لیکن پھر بھی وہ جیتا آخر کیوں، اس لیے کہ پہلی بار کسی جماعت نے دو ٹوک معاشی مسائل کو اٹھایا اور عام لوگوں کی معاشی اور مادی محرومیوں اور ضرورتوں کو اپنی انتخابی مہم کی بنیاد بنایا اور بھٹو نے سیدھا سادا روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ لگایا۔ اب اس نعرے نے پاکستان کے پسے ہوئے عوام کی آنکھوں میں چمک اور سینے میں حرارت پیدا کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تمام زمیندار، تمام سرمایہ دار اور کھاتے پیتے لوگ اسلام پسندوں کی صف میں ہیں اور غریب غرباء بھٹو کے ساتھ ہیں، تو یہ جیت معاشی بنیادوں پر حاصل ہوئی۔ لیکن ہوتا کیا ہے کہ سوشل ڈیموکریٹ قسم کی جماعتیں اور لیڈر معاشی مسائل کو ابھار کر عوام کو متحرک ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر خود اس جنّ سے خوف کھانا شروع کر دیتے ہیں جس کو وہ خود بوتل سے باہر نکالنے کا عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ اسی طرح کا عمل ہمارے ہاں ہوا۔ بھٹو لرزہ براندام تو

نہیں ہوا لیکن اس نے عوام کو باقاعدہ منظم کرنے کا جتن بھی نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ ابھار۔ یہ جوش، یہ جنوں مختلف راہوں پر بہہ نکلنے لگا بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تمام ابھار اور جوش کو شعوری طریقوں سے مختلف راہوں پر ڈالنے کے جتن ہونے لگے اب اور باتوں کو چھوڑ دیجئے صرف ایک لاکھ پاکستانیوں کو حج پر بھیجنے کے مسئلے کو ہی لیجیے، اب اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو حج کے لیے بھیجنا کوئی معمولی بات نہیں اور بالخصوص پاکستان جیسے غریب ملک کے واسطے جو زرمبادلہ کے لیے دریوزہ گری تک کرنے پر بعض دفعہ مجبور ہوا اس کے لیے تو اتنے افراد کو حج کے واسطے زرمبادلہ فراہم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن حکومتیں تمام کام اپنی سیاسی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کرتی ہیں۔ عوام سے داد وتحسین حاصل کرنا اور مقبولیت عامہ کی سند کا حقدار ٹھہرنا اپنی جگہ بہت اہم ہوتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر یہ اقدام سیاسی ضرورتیں پوری نہ کرتا ہو تو حکومتیں شاذ ہی یہ اقدام اٹھاتی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں حاجیوں کا اہتمام کر کے حکومت نے ایک طرف اسلام پسندوں کے پورے پروپیگنڈے کی نفی کر دی کہ بھٹو سوشلسٹ ہے اور کافر ہے بھٹو نے ثابت کر دیا کہ اسلام ہمارا دین ہے اور دین کی خدمت بھٹو سب سے زیادہ کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک پہلو تھا لیکن دوسرا پہلو جو مجھے یہاں آ کر محسوس ہو رہا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں حاجیوں کو حج کے فریضے کے لیے روانہ کرنا جہاں داخلی سیاست کے تقاضے تھے وہاں خارجی تعلقات کی استواری کے لیے بھی ضروری تھا اور قریب قریب ایک لاکھ کی تعداد میں حاجیوں کو سعودی عرب میں بھیجنے کا مقصد شاہ فیصل کو متاثر کرنا تھا اولاً شاہ فیصل پر یہ ثابت کرنا کہ جماعت اسلامی نے ذوالفقار علی بھٹو کو جو اسلام دشمن اور سوشلسٹ کے روپ میں پیش کیا ہوا ہے اس کو جھٹلانا اور بھٹو اور اس کی حکومت کی اسلام کی شیفتگی کے دعوے کا ثبوت مہیا کرنا تھا چنانچہ مختصراً ہمارا مقصد دنیائے اسلام اور عرب دنیا کی توجہ کو پاکستان کی طرف مبذول کرانا ہے اور بالخصوص سعودی عرب کی حکومت اور شاہ فیصل کو اپنی اسلام دوستی کا قائل کرنا ہے۔

کیونکہ شاہ فیصل کو سوشلزم تو ایک آنکھ نہیں بھاتا اور ہمیں تو شاہ فیصل کو

ہر حالت میں رام کرنا ہے کیونکہ اس کے پاس ڈالر ہیں اور وہ ڈالر دینے کی قدرت رکھتا ہے
اس لیے ہماری ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اسلام کا سہارا زیادہ سے زیادہ لیں اور اپنے سوشلزم
کو مقابلتہً ГОМ КЕА میں رکھیں۔

یہ ہمارا مقدر ہی نہیں بلکہ خود دنیائے عرب کی مقابلتہً ترقی پسند حکومتوں کا بھی قریب قریب یہی مقدر ہو رہا ہے کیونکہ یہ حکومتیں بھی ڈالر کی طلب گار ہیں۔ سوشل ڈیموکریٹ حکومتوں کا یہی مقدر ہوتا ہے کہ وہ جیتی ہوئی بازیاں صرف اس لیے ہار جاتی ہیں کہ عوام کے ابھار سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ اس ابھار کو اگر آپ منطقی نتیجہ تک لے جائیں تو پھر ملکی استحصال پسندوں کو ہی صرف پیچھے نہیں دھکیلنا ہوتا بلکہ عالمی سامراج کے خلاف بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور اپنی جگہ سامراج دشمن متحدہ محاذ میں تلاش کرنی ہوتی ہے لیکن یہ جان جوکھوں کا کام ہے آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم بھی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو سمجھنے کے باوجود اس کے پھیلاتے ہوئے جال کے تانے بانے کو توڑنے کی سکت نہیں رکھتے بلکہ اس جال میں پھنسنے پر مجبور ہیں اور سچ یہ ہے کہ سعودی عرب کی موجودہ حکمت عملی بھی ایک بہت بڑا جال ہے اور ہم ہیں مجبور و بے بس۔

اس وقت سعودی عرب کی گھڑیوں کے مطابق دن کے پو۔ نے پانچ یعنی قبل دوپہر ہے کیونکہ ظہر کی نماز سات بجے ہوتی ہے۔ ہم حرم میں آ بیٹھے ہیں پہلے آنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جگہ مل جاتی ہے اور دھکم پیل سے انسان محفوظ رہ جاتا ہے آج صبح کو حرم نہیں آئے گو اٹھے اسی وقت تھے لیکن حرم نہ پہنچ سکے تھے۔ ایک قسم کے معمول میں فرق آ گیا تو طبیعت میں کچھ اضمحلال اور بے سکونی ہے اور گھر سے خط نہ آنے کی وجہ سے بھی اس بے سکونی میں قدرے اضافہ ہو گیا ہے۔ ویسے آج بھی کوئی خط نہیں آیا عام لوگوں کو خطوں کی خاصی شکایت ہے۔

ظہر کی نماز میں ابھی پونے دو گھنٹے ہیں چنانچہ میں نے صبح کی کمی اس وقت پوری کرنیکا فیصلہ کیا اور ایک گھنٹہ پانچ منٹ تک حرم کے چکر کاٹے۔ یہ تقریباً ساڑھے

چار میل بنتے ہیں اس کے بعد نماز ادا کی۔ جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے تو ہجوم دیدنی تھا۔ عائشہ کا رنگ فق تھا۔ کتنی بار فیصلہ کیا کہ ٹھہر جاتے ہیں۔ لیکن کب تک ٹھہر سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے تقریباً دھکم پیل میں پندرہ منٹ لگے اور حرم سے باہر نکلے تو بوندا باندی ہو رہی تھی ابھی بوندا باندی میں گھر آئے عائشہ کو گھر بھیجا اور میں تندور سے نان لینے کے لیے گیا۔ تمام راستے میں کیچڑ تھا اور پانی سڑکوں پر بہہ رہا تھا تمام کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے بہرحال نان لایا۔ کپڑے اتارے اور کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں ناول پڑھتا رہا۔ عصر کی نماز گھر پر ہی پڑھی اور اس وقت کمرے میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں اور باہر زور کی بارش ہو رہی ہے اس حالت میں اب حرم میں جانا ممکن نہیں ہے۔ اغلب یہی ہے کہ اب گھر پر ہی باقی نمازیں ادا ہوں گی۔

۹ر جنوری

منگل کا دن ہے وہی معمول ہے تہجد سے پہلے ہی آج حرم شریف میں پہنچ گئے ہیں میں نے رات عشاء نہیں پڑھی تھی چنانچہ عشاء بھی ادا کی اور اس کے بعد پندرہ منٹ کے لیے چکر کاٹے تو تہجد کی اذان ہو گئی۔ اس کے بعد تہجد کے نوافل ادا کیے اور اب یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

یہاں دیس دیس کے لوگوں کے لباس پر غور کر رہا ہوں تو کم از کم ایشیا اور عرب کے لباسوں میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے جہاں تک شلوار کا تعلق ہے یہ تمام لباسوں میں قریب قریب جوں کی توں برقرار ہے۔ ترکی کی عورتیں ہوں یا پاک و ہند کی عورتیں، شلوار مشترکہ ہے اب شلوار کی تراش خراش میں فرق ضرور پڑ گیا ہے

ویسے ترکی ہو یا ایران یا وسطی ایشیا کا کوئی اور ملک، ان کے لباسوں کا جب ذکر ہوتا ہے تو یہ قدرے بزرگ نسل کا ہوتا ہے کیونکہ نئی نسل تو اب ان بیشتر ممالک میں سکرٹ پہننے لگی ہے ویسے یہاں ترک عورتیں تو زیادہ تر بڑی عمر کی نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک عربی ممالک کا تعلق ہے وہاں سے خاصی جوان لڑکیاں بھی آئی ہوئی ہیں لیکن ان کا لباس وہی عربوں کا روائتی لباس ہے یا پھر یہ فریضۂ حج کے لیے روائتی لباس پہنا گیا ہوگا ویسے صرف لباس ہی نہیں پردہ بھی بہت حد تک ایک نوعیت کا ہی ہوتا ہے۔

اس وقت ظہر کی نماز میں ایک گھنٹہ باقی ہے اور میں حرم میں آگیا ہوں۔ خیال تھا کہ یہاں بیٹھ کر کچھ لکھوں گا اور آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ چکر بھی لگاؤں گا۔ لیکن ایک گھنٹہ پہلے ہی ہجوم کا یہ عالم ہے کہ الحفیظ والامان۔ اس لیے میں ایک چوکور ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہوں، جاتے نماز بچھالی ہے۔ میں یہاں مستقل چوکور ستون ڈھونڈ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھتا رہا ہوں اس سے سہارا مل جاتا ہے اور ٹیک لگا کر لکھنے میں آسانی ہوتی ہے آج صبح عائشہ چائے کے بغیر حرم میں آگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی طبیعت سخت مضمحل ہوگئی اور فجر کی نماز کے فوراً بعد ہم گھر واپس چلے گئے۔ حرم سے باہر نکلتے ہوتے وہی دھکم پیل برداشت کرنی پڑی لیکن اب عائشہ کو بھی اس دھکم پیل میں اپنے کو ADJUST کرنے اور راہ بنانے کا ڈھنگ آتا جا رہا ہے۔ گھر پہنچ کر ناشتہ کیا دراصل بن کا ناشتہ نہیں ہوتا اور نان جہاں لگتے ہیں اس تندور پر بے حد ہجوم ہوتا ہے۔ اس لیے آج سستی کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ناشتہ بے مزہ رہا۔ پھر میں اکیلا ہی سودا سلف لانے کے لیے بازار گیا۔ راستے میں ملک فضل مل گیا آج حرم میں مظہر علی خاں کے بڑے بھائی منصور پر بھی نگاہ پڑی تھی۔ یہاں کا ہجوم اور طور طریقے وہی ہیں جو روزِ محشر کے متعلق کتابوں میں لکھا گیا ہے یعنی کوئی ایک دوسرے کا پرسان حال نہیں ہوگا۔ لوگ ملیں گے اور گزر جائیں گے۔ خیریت کا پوچھنا بھی رسمی ہوگا۔ نہ جانے یہ کیوں ہے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ ہجوم ہے اتنا ہجوم

ہوتا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔

ابھی ابھی ابرار جو پولیس افسر ہے اور آج کل میانوالی میں ایس پی ہے سے ملاقات ہوگئی بہت پیار اور محبت سے گلے ملا شورش کی باتیں ہوتی رہیں معلوم ہوا ہے کہ ۳ جنوری کو جو رہائی متوقع تھی وہ نہیں ہوئی۔

میرے ساتھ ایک شخص بیٹھا ہے وہ شکل وصورت سے بنگالی مسلم معلوم ہوتا ہے لیکن اس نے بتایا کہ وہ جنوبی افریقہ کا باشندہ ہے اور تین پشتوں سے وہیں مقیم ہے اس کے جدامجد کلکتہ سے ڈربن منتقل ہوئے تھے وہ جنوبی افریقہ کی بے حد تعریف کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہاں پر ہندوستانی صرف ڈربن میں تقریباً ساڑھے سات لاکھ کے قریب ہیں ویسے گجراتی بورے، میمن اور بنیے خاصی تعداد میں ہیں وہاں مسلمانوں نے اردو عربی، فارسی، زبانوں کے لیے مدارس بھی قائم کیے ہوئے ہیں اور اپنی ثقافت کو محفوظ رکھے ہوتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر ہی احساس ہوتا ہے کہ اسلام کی بین الاقوامی طور پر کتنی حیثیت اور اہمیت ہے۔

شام کی نماز کے بعد یہ سطور لکھنے لگا تھا مگر جس ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوں وہاں جوتیاں رکھنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اس لیے لکھنے کا سلسلہ منقطع ہوتا رہتا ہے یہاں سے جوتیاں غائب بھی بہت ہوتی ہیں اور رکھ کر انسان بھول بھی جاتا ہے کہ کہاں رکھی تھی، کیونکہ تمام دالانوں، ستونوں کی یکسانیت اتنی زیادہ ہے کہ انسان اپنی جگہ کو ہر بار بھول جاتا ہے۔

یہاں اکثر ملکوں سے حاجی قافلوں کی صورت میں آتے ہیں اور اکٹھے ہی واپس جاتے ہیں۔ اس اجتماعیت سے خرچ میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ سفر کی مشکلیں بھی کم ہو جاتی ہیں اور سفر کی جو بوریت ہوتی ہے وہ بہت حد تک دور ہو جاتی ہے۔

عبادت کے طریقے بھی یہاں مختلف ہیں یہاں شافعی مکتب فکر کے لوگ خاصی

تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مصری اور افریقی زیادہ ہیں ان کی سب سے بڑی پہچان تو یہ ہے کہ وہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں آمین وہ بھی بلند آواز میں ہی کہتے ہیں۔

۱۰/ جنوری

بدھ کا دن ہے تہجد کے نوافل پڑھ کے بیٹھا ہوں ابھی فجر کی اذان میں قریب قریب ایک گھنٹہ ہے پہلے تو معمول تھا کہ اس دوران میں چکر لگا لیتا تھا اور سیر کا معمول تھوڑا بہت پورا ہو جاتا تھا لیکن اب تو ہجوم ہلنے ہی نہیں دیتا اس لیے چکروں کا معمول قطع ہو گیا ہے نیز پریشانی اور بے سکونی کا عالم قریب قریب وہی ہے جو کراچی سے روانگی کے وقت تھا اب جیسے جیسے حج کی تقریبات قریب آ رہی ہیں اور منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں ادا کی جانے والی رسومات کی تکمیل اور فرائض کی ادائیگی کا وقت قریب آ رہا ہے تو پریشانی بڑھ رہی ہے کہ اتنے ہجوم میں یہ رسوم اور عبادات کیسے ادا کی جا سکیں گی اور ہو بھی سکیں گی یا نہیں اور بقول عائشہ کے یہ تمام حاجی خود بکرے دنبے ہیں جو ان پانچ دنوں کی تقریبات اور رسوم کے لیے پالے جا رہے ہیں۔

نہ جانے کیونکر تمام وہ حادثات، سفر اور واقعات جن پر ایک عالم مجھ پہ رشک کرتا ہے مجھے ان سے گزرنے کے لیے شدید اذیت، پریشانی اور بے سکونی برداشت کرنی پڑی ہے اب یہی حج کے فریضے کی ادائیگی پہ ایک دنیا مجھ پہ رشک کر رہی ہے لیکن میں ہی نہیں بلکہ عائشہ بھی زبردست اذیت سے دوچار ہے اور دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اللہ تعالےٰ یہ دن یہ تقریبات یہ رسوم اور یہ پورا سفر بخیر و خوبی گزار دے۔ لندن گئے تھے تو یہی حال ہوا تھا اور واپس آ رہے تھے تو اسی قسم کی بے سکونی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ درست ہے کہ ہر ایسے حادثے کا انجام اللہ کے فضل سے بخیر و خوبی ہوتا رہا۔ اور ایسے تمام سفروں اور واقعات سے سرفراز اور کامیاب و کامران نکلا لیکن

جہاں تک اس دوران میں بے سکونی اور پریشانی کا عالم ہے وہ جو ہم پر گزرتی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔کسی کو ہم اس میں شریک نہیں کر سکتے۔

اس بے سکونی اور بے اطمینانی نے عائشہ کو بیمار کر دیا۔تمام رات اس کا گلا درد کرتا رہا اور کھانستی رہی صبح تہجد سے بھی ایک گھنٹہ پہلے میں اٹھا اس کو چائے بنا کر دی اور ساتھ اسپرو دی تو پھر حرم شریف میں آنے کے قابل ہوتی اس وقت ہمیں حرم میں آئے اڑھائی گھنٹے ہو چکے ہیں اب فجر کی نماز کو بھی تقریباً سوا گھنٹہ ہو چکا ہے۔اور ہجوم خاصا کم ہو گیا ہے۔اب یہاں سے نکلیں گے اور پھر سودا سلف اور ناشتے کا اہتمام کریں گے۔آج معلم کو بھی بقایا رقم دینی ہے۔

ویسے ہم پاکستان سے بالکل کٹے ہوتے ہیں۔معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے ویسے یہاں کے ہنگامے اور شور سے فرصت نہیں ملتی کہ اس طرف دھیان جا سکے۔

اس وقت وقت جب یہ سطور لکھنے لگا ہوں تو عصر کی نماز ہونے والی ہے اور میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں آج فجر کی نماز کے بعد جو کمرے میں آئے ہیں اس کے بعد کمرے سے نہیں نکلے۔علی الصبح حرم سے نکل کر ہم تندر سے نان لے کر آتے تو ساتھ کے ہمسایوں نے مرغی کا سالن اور دو چپاتیاں ناشتے کے لیے دیدیں تقریباً پندرہ دن کے بعد ہم نے چپاتیاں اور گوشت کھایا اور خوب سیر ہو کر کھایا۔اس کے بعد میں نے نیا ناول پڑھنا شروع کر دیا۔اس میں مصروف رہا۔لیکن یہ سب مصروفیت دراصل آنے والے دنوں کے خیال سے پیدا ہونے والی بے چینی اور بے سکونی پر قابو پانے کے لیے تھی چنانچہ عائشہ پر بے سکونی کی اذیت سب سے زیادہ طاری ہے اور وہ مجھے بھی پریشان کر رہی ہے ہر دو گھڑی کے بعد وہ کہہ اٹھتی ہے کہ "دنبو" تیار ہو جاؤ۔کھا پی لو پرسوں ذبح ہونا ہے

عصر کی نماز گھر پر ہی پڑھی ہے نیچے پورا بازار نماز پڑھنے والوں سے بھرا ہوا ہے جہاں کہیں کوئی ہے وہ وہیں نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے یہاں نماز کے اوقات میں پورا کاروبار معطل ہو جاتا ہے کوئی لین دین نہیں ہوتا اور دکاندار دکانیں اسی طرح چھوڑ کر مسجد میں

نماز کے لیے چلے جاتے ہیں یا دہیں دکان کے اوپر یا سڑک پر نماز ادا کر لیتے ہیں یہاں نماز اور تسبیح قریب قریب عادت ثانیہ بن گئی ہے اب ان کے لیے نماز کوئی بوجھ نہیں ہے بلکہ جس طرح سونا یا کاروبار کرنا ایک معمول ہے۔ اسی طرح یہ نماز بھی ایک معمول ہے۔

ویسے یہ مذہب بھی کتنی بڑی امید ہے کروڑوں انسان دعائیں مانگ کر اپنی محرومیوں اور تلخیوں کے بھاری بوجھ کو سینے سے اتار دیتے ہیں اگر یہ امید ان سے چھین لی جائے اور اس کے عوض میں نئی امید ان کو مہیا نہ کی جائے تو یہ زندگی کتنی وبال ہو جائے یہ دکھ سہنا دوبھر ہو جائے اب دکھ سہتے ہیں اور اس امید پر سہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ جلد ہی ان دکھوں سے نجات دے گا دعائیں مانگتے ہیں۔ التجا کرتے ہیں۔ گڑگڑاتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرزوئیں یہ خواہشیں اب پوری ہوئیں کہ ہوئیں۔ اس کے بعد مسلسل دعائیں اور مسلسل آرزوئیں۔ کچھ کی تکمیل کچھ کی عدم تکمیل۔ یہ زندگی کا ایک مسلسل دلفریب تسلسل ہے جس میں ایک گونہ لطف بھی ہے اور کیف بھی اس میں تلخی بھی ہے اور مایوسی بھی یہی تسلسل کبھی بغاوت پر انسان کو مجبور کر دیتا ہے اور کبھی اس کو زیادہ لجاجت کے ساتھ خدا کے حضور میں سرنگوں کر دیتا ہے۔

یہاں کا تجربہ دیکھ کر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو اس پرستش میں جو راحت، لذت اور سکون میسر آتا ہے صدیوں تک اس کا کوئی متبادل پیش نہیں ہو سکے گا اور اس کا انحصار قدرت کی تسخیر پر ہوگا اور جن ممالک میں یہ قدرت کی تسخیر کا عمل جاری وساری رہتا ہے وہاں کی صورت حال بالکل مختلف ہے کیونکہ قدرت کا عملِ تسخیر سیاسی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اب جن ممالک میں عوام اپنی زندگیاں بدلنے کے لیے ایک نیا سماجی ڈھانچہ استوار کر رہے ہیں وہاں یہ عمل صرف سیاست کی دنیا میں ہی رونما نہیں ہوتا۔ بلکہ روحانی اور مادی دنیا میں بھی انقلاب بپا ہوتا ہے اور مذہب کے روائتی ڈھانچے ٹوٹنے لگتے ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار نئے اخلاق اور نئی روحانیت جنم لیتی ہے۔ یہ جمہوریہ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں پر کنفیوشس کی مذہبی تعلیمات کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے کیونکہ یہ تعلیمات آج کی دنیا میں اور جدوجہد میں ممد ہونے کی بجائے رکاوٹ بنتی ہیں اس کے باوجود جو بھی وہاں جاتا ہے وہ

ان کے اخلاق، ان کے کردار اور ان کے رہن سہن، ان کی صفائی، ان کی پاکیزگی کے لیے رطب اللسان ہوتا ہے۔ یہ آخر کیوں؟ اس کی وجہ واضح ہے کہ آج ظلم و استحصال کے خلاف جدوجہد میں ایک نیا اخلاق جنم لے رہا ہے جو پرانے اخلاق، پرانی روحانیت، پرانی عبادتوں سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے یہ اس نئے انسان کی رفعتیں ہی ہیں جس نے نئے ویت نام کو جنم دیا ہے جس نے اس دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سامراج کو شکست دی ہے تیرہ سو سال پہلے عرب نے اسلام کا پرچم لے کر ایک دنیا کو مسخر کیا تھا وہی عمل آج رونما ہو رہا ہے۔ آج افریقہ کے جنگلات ہوں یا ایشیا کے ممالک وہاں کا انسان کمیونزم اور سوشلزم کا نام لے کر جدوجہد کر رہا ہے وہ ایک نیا ضابطہ ترتیب دے رہا ہے اب ان ممالک کے بسنے والوں نے کوئی اپنے مذاہب کو تیاگ نہیں دیا ہے لیکن نئے نظام کے لیے وہ جدوجہد کر رہے ہیں اس کے دوران وہ غیر شعوری طور پر اپنے فکر کی، اپنی سوچ کی نئی بنیادیں تلاش کرتے ہیں جو ان کی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور باہر کی دنیا والے جو اس عمل سے اور ان کے نتائج سے بے بہرہ ہوتے ہیں وہ سامراج کے اس پروپیگنڈے میں آجاتے ہیں کہ سوشلسٹوں نے مذہب کو دیس بدر کر دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ ٹوٹنے لگتا ہے اور بہت سے لوگ اس مذہب کے دوران مذہب کو چھوڑ بھی دیتے ہیں لیکن مذہب کو جو چھوڑنے کا عمل ہے وہ صرف سوشلسٹ جدوجہد ہی کے نتیجہ میں رونما نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر سوشلسٹ ممالک میں بھی رونما ہوتا ہے بلکہ سوشلسٹ ممالک میں تو اگر مذہب کی بنیادوں پر اخلاقی اقدار کو دھکا لگتا ہے تو دوسری طرف وہ نئی انقلابی اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہونے والی اخلاقی اقدار کو جنم دیتے ہیں۔ مجھے اس وقت رہ رہ کر ہیولٹ جانسن یاد آتے ہیں۔ یہ ہیولٹ جانسن بیس تیس برس برطانیہ کے مذہبی پیشوا کے عہدے جو دین کا کنٹربری کہلاتا ہے پر فائز رہے انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے سالوں میں سوویت روس کے کئی ایک دورے کیے اور اس کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات دو مختلف النوع کتابوں میں قلم بند کیے اور اس میں عیسائیت، مذہب اخلاق اور سوشلزم پر ایک عیسائی، ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے اظہار خیال کیا۔ ان کا کہنا

ہے کہ سوویت روس میں جو اتنا بڑا تجربہ کیا جا رہا ہے ان کی بنیاد معاشی زندگی کے بالکل نیے اصولوں پر رکھی گئی ہے یہ اصول ہر شخص سمجھتا ہے اور انھیں پسند کرتا ہے ان اصولوں میں اور ہماری زندگی (انگلستان کی زندگی) کے اصولوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے نظام کی بنیاد شخصی نفع اندوزی پر ہے جس کی وجہ سے لاکھوں آدمیوں کو لوٹا کھسوٹا جاتا ہے۔

ہمارے نظام کی بنیاد اخلاق پر نہیں ہے ہم اس کی تائید صرف یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے اس کا کوئی اور بدل نہیں ہے۔ ایک اتوار کو ہم گرجا جاتے ہیں اور وہاں بھائی چارہ، سچائی اور انصاف کی قسم کھاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر ہم دوسرے ہی دن اپنے ساتھیوں کی گردن کاٹنے کی فکر کرتے ہیں اپنے ذاتی فائدے کے لیے دوسروں کو لوٹنے اور نقصان پہنچانے سے ذرا دریغ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ بہت سارے نیک دل لوگوں نے یہ تضاد دیکھ کر چرچ جانا چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سارے مخلص نوجوان جھوٹ بناوٹ اور منافقت دیکھ کر اس نظام کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے نظام کی اخلاقی بنیاد۔ اس کا سائنٹفک پہلو تو اور بھی زیادہ بدتر ہے۔ اس میں ایک طرف دولت کی افراط ہے اور ضائع کی جاتی ہے اور دوسری طرف آبادی کا بڑا حصہ بھوکوں مرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لاکھوں آدمیوں کی صلاحیتیں بے کار ہو جاتی ہیں انھیں تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل نہیں رہتے وہ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں اور یہ سوسائٹی ان کی صلاحیتوں سے کوئی کام نہیں لے سکتی۔

ہماری اس سوسائٹی کی ساخت ایسی ہے کہ چند سال کے بعد معاشی بدحالی پیدا ہو جاتی ہے بحران آتا ہے جس کی وجہ سے بیروزگاری بڑھ جاتی ہے امیر اور زیادہ امیر بن جاتے ہیں۔ مزدور بدحال اور غریب ہو جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں میں آپس میں لڑائی چھڑ جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں سوویت یونین کی سوسائٹی ہے جہاں مقابلہ کی بجائے باہمی امداد کو

دخل ہے اور معاشی طوائف الملوکی کی جگہ خاکہ بندی ہے یہاں فرد سے زیادہ سوسائٹی کو اہمیت حاصل ہے یہاں ایک محدود طبقہ کی بھلائی پیش نظر نہیں رہتی بلکہ سارے سماج کی بھلائی دیکھی جاتی ہے اس لیے ہر فرد کی بھلائی کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ نفع کمانے کے جذبہ کی جگہ خدمت کا جذبہ آجاتا ہے۔ پیداوار اور اس کی تقسیم خاص اصولوں پر کی جاتی ہے۔ اس لیے سائنس کی مدد قدم قدم پر حاصل کی جاتی ہے جس کی وجہ سے خوش حالی بڑھ جاتی ہے۔

جب انسانی زندگی کے متعلق نقطۂ نظر ہی بدل جاتا ہے تو ایک نیا اخلاقی معیار بھی قائم ہو جاتا ہے ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا موقع ملتا ہے جس کی وجہ سے ایک نئی انسانیت ترقی پاتی ہے تمام لوگ ملک کی تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں جس کی وجہ سے کلچر میں غیر معمولی ترقی ہوتی ہے۔ ماضی کی روایتوں کو بھلایا نہیں جاتا بلکہ پچھلے سرمائے کو دل سے لگا کر رکھا جاتا ہے اور اسی سے نئے کلچر کی تعمیر میں کام لیا جاتا ہے۔ اگر پھر جنگ نہ آئی اور اس نے اس بڑھتی اور ابھرتی زندگی میں رخنہ نہ ڈالا تو وہ دن دور نہیں ہے کہ جب اس دیس میں ضرورت کی ہر چیز کی افراط ہو گی۔ آزادی کی نئی نئی راہیں کھلیں گی اور انسانوں کی صلاحیتیں تیزی سے ابھریں گی۔

اور یہ صرف ہیولٹ جانسن ہی نہیں بلکہ جتنے بھی دیانتدار مذہبی لوگ اشتراکی ملکوں میں گئے ہیں وہ وہاں سے متاثر ہو کر ہی آئے ہیں۔

آج ویت نام کو دیکھا جائے، کیوبا کو دیکھا جائے کون سا اسلامی ملک ہے جہاں عصمت فروشی کے اڈے نہیں ہیں لیکن سوشلسٹ ممالک میں بھی کوئی اڈہ دکھایا جائے۔ جس ملک میں بھی عورت اور مرد کو معاشی آزادی ہو گی ان کے پاس روٹی روزگار کے مواقع ہوں گے اور وہ محنت کر رہے ہوں گے تو پھر ایسے ملک میں کوئی عورت اپنا جسم چند پیسوں کی خاطر کیوں فروخت کرے گی وہاں پر جنسی تعلقات قائم ہوں گے بھی تو وہ محبت، دوستی اور پیار کی بنیادوں پر ہوں گے۔ جبر اور معاشی دباؤ ان تعلقات کی بنیاد نہیں ہو گا۔ جب اس قسم کا نظام ہو گا تو اس میں لالچ، حرص اور زن، زر، زمین کے لیے تمام تنازعات ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ اخلاق کی بلند بنیاد ہے۔

مجھے اس وقت اپنا بیس برس پہلے کا دورۂ چین یاد آرہا ہے یہ ۱۹۵۲ء کا سال تھا پاکستان

سے پیر مانکی شریف کی قیادت میں امن کانفرنس میں شرکت کے لیے ایک بہت بڑا وفد گیا تھا۔ دراصل اس وفد کی ترتیب اس وقت کی حکومت کی اجازت اور اس کی تشکیل کی پشت پر تو میاں افتخار الدین ہی تھے لیکن ان کی سب بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ خود قائد نہیں ہے۔ بلکہ غیر سوشلسٹ اور مذہبی رہنما کو قائد بنایا اس وفد میں مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمن اور عطاء الرحمن بھی تھے سندھ سے جی ایم سید بھی تھے اور صوبہ سرحد سے پیر مانکی اور حنیف خاں بھی تھے۔ غرضیکہ ہم میں سے کچھ نے اس کانفرنس کے بعد عوامی جمہوریہ چین کا۔ دورہ بھی کیا تھا عوامی جمہوریہ چین کے جس شہر میں بھی گئے وہاں قیمتوں میں ہم نے کلیتاً یکسانیت پائی اور کوئی کم کرنے کے مطالبے کا رواج ہی نہیں تھا لیکن اس کے مقابلے میں ہم جب ہانگ کانگ آتے اور وہاں چینی دکانداروں سے ہی خریداری کرنے لگے تو اگر وہ کسی شے کی قیمت سو ڈالر بتاتے تھے تو بالآخر سودا ۲۵ ڈالر پر ختم ہوتا لیکن ہم کو یہ خدشہ لگا رہتا کہ ۲۵ ڈالر ادا کر کے بھی ہم کہیں لٹ تو نہیں گئے تو یہ ہے دو نظاموں کی اخلاقی اقدار۔

شام کی نماز میں تقریباً آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ اور حرم شریف میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں اس زمانے میں اگر آپ ایک دن حرم شریف میں نہ آئیں تو انسان کچھ کھویا کھویا سا لگتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ MAINSTREAM سے کٹ گیا ہے اور عام دھارے نے اسے پیچھے چھوڑ دیا ہے یہاں کی رونق یہاں کے ہنگامے، ہجوم، پھر کھلی ہوا یہ سب مل کر طبیعت کو بشاش بنا دیتے ہیں اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جس فریضے کو پورا کرنے کے لیے یہ سفر کی کٹھنائیاں برداشت کی ہیں اس سے گریز کیوں ہو۔ اب یہاں پہنچ کر طبیعت قدرے ہلکی ہوتی ہے اور وہ جو حج کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک گونہ TENSION محسوس کر رہے تھے اس میں بھی کچھ کمی آئی ہے اب کل کا دن رہ گیا پرسوں صبح سے سخت ہنگامہ پرور دن شروع ہو جائیں گے اور یہی پانچ دن حج کی جان ہیں ان دنوں میں زندگی بلا کی متحرک اور تھکا دینے والی ہوتی ہے۔

شام کی نماز کے تھوڑے وقفے کے بعد مسجد الحرام سے نکل آتے اس لیے کہ اس وقت ہجوم

کم تھا۔ کیونکہ لوگ عام طور پر شام کی نماز کے بعد حرم میں ہی رک جاتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں یا قرآن پڑھتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد وہاں سے نکلتے ہیں ہم بھی ہمیشہ یہی کرتے رہے لیکن اب عشاء کے بعد ہجوم میں نکلنا ناممکن ہوگیا ہے اس لیے جلد نکل آئے گھر آکر میں نے اوولٹین سادے پانی میں ملا کر پی اور دو تین بسکٹ کھا کر جلد ہی سو گیا۔ عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی لیکن نیند بہت گہری آئی ۔

۱۱، جنوری

جمعرات کا دن ہے معمول کے مطابق حرم شریف میں نہیں گئے رات بھر عائشہ کا گلا درد کرتا رہا اور وہ کھانستی رہی۔ مجھے رات کو بہت ہی گہری نیند آئی۔ تہجد کی اذان پر اٹھا۔ عائشہ مجھ سے پہلے اٹھ کر تہجد کی نماز کے لیے کھڑی تھی اتنے میں میں نے چائے بنائی اور اس کو اسپرو اور چائے بنا کر دی۔ اس کے بعد تہجد اور فجر کی نمازیں ادا کیں نماز کے بعد حج کے متعلق کتاب پڑھی اور اس میں جو دعائیں لکھی ہوئی تھیں وہ پڑھیں۔ نہ جانے کیا عالم تھا اور کیا کیفیت تھی کہ رقت طاری ہوگئی اور آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے اور یہ دعائیں واقعی رقت انگیز اور کیفیت طاری کرنے والی تھیں یہ وہ دعائیں تھیں جو رسول خدا نے عرفات کے میدان میں مانگی تھیں۔ بالخصوص اس دعا نے مجھے بہت ہی متاثر کیا جس میں کہا گیا تھا۔

اے اللہ میرے سینے کو نور سے بھر دے۔
میری آنکھوں کو نور سے بھر دے۔
میرے کانوں کو نور سے بھر دے اور میرے دل کو نور سے بھر دے
میرا سینہ کھول دے میرے معاملات کو آسان کر دے۔
سینے کے وسوسوں، کاموں کی ابتری اور عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

یہ دعائیں اکثر ایسی ہیں. جو بچپن میں کیا کالج تک مجھے ازبر تھیں اور رات اور دن کو میں اکثر پڑھا کرتا تھا اور ان کا ورد کیا کرتا تھا۔ اس رقت اور دعاؤں کے پڑھنے سے آج آنے والے تقریبات اور ہنگاموں کے لیے اپنے کو اب میں تیار پاتا ہوں اتنے میں فجر کی نماز پڑھ کر لوگوں کا ہجوم حرم شریف سے نکلنا شروع ہوا تو ہم نے اس منظر کو اپنے چوبارے کی کھڑکیوں سے دیکھنا شروع کیا۔ تاحد نظر انسان ہی انسان نظر آتے تھے جو چیونٹی کی چال سے حرم سے نکل کر سڑکوں پر رینگ رہے تھے کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ آج کے دن ہجوم پورے جوبن پر آ رہا ہے اس سات لاکھ کی آبادی میں دس لاکھ کے قریب نفوس اور داخل ہوتے ہیں کیا سماں ہو گا یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور کل منیٰ کے شہر میں اور پرسوں عرفات کے میدان میں کیا منظر ہو گا تمام انسان احرام باندھے ہوئے سفید براق چادروں میں لپٹے کیا منظر پیش کریں گے یہ تمام منظر انسانوں پر کتنا گہرا نفسیاتی اثر ڈالے گا۔ یہی نفسیاتی فضا لوگوں کو مطلوبہ راہوں پر لگانے میں مدد دیتی ہے لیکن اس کے لیے انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو اس فضا سے استفادہ کر سکے۔ مثال کے طور پر آج حج کی ساتویں کو ظہر کی نماز کے بعد حرم شریف میں خطبہ دیا جاتا ہے جس میں حج کے متعلق بیان ہو گا اگر سعودی عرب کی حکومت MAGNETIC ہو اور ترقی پسند ہو تو وہ اس خطبے میں اہم باتیں کہہ سکتی ہے اور صرف کہہ ہی نہیں سکتی بلکہ کیوں نہ انتظام ہو کہ پانچ سات اہم زبانوں میں یہ خطبہ ایک ساتھ نشر ہو اور تمام حاجی اس سے مستفید ہو سکیں۔ پھر اسی خطبے کو اس سے پہلے تمام زبانوں میں شائع کیا جائے اور وہ تمام حاجیوں میں تقسیم کیا جائے اسی طرح سے عرفات کے میدان میں جو خطبہ ہونا ہے اس کو بھی عام حاجیوں تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے اور اس خطبے کو مسلمانان عالم اور بین الاقوامی مسائل سے اشارۃً ہم آہنگ کیا جائے اس لیے اگر سعودی عرب میں ایک ترقی پسند حکومت قائم ہو جائے تو اس حج کی تقریب کو بڑے دوررس نتائج کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے سعودی عرب میں ایک مثالی حکومت کا قیام ضروری ہے تاکہ وہ آنے والوں کو متاثر کر سکے۔ یہاں کے لوگوں کو اگر غربت، بیروزگاری

سے نجات ہو تو دنیا بھر سے آنے والے حاجی لازماً اس سے متاثر ہوں گے اور ان میں اپنے اپنے ملکوں میں جدوجہد کا ایک ولولہ جنم لے گا۔ شاید کسی اور حکومت یا ملک کو اتنا زبردست موقع حاصل نہیں ہے جتنا کہ سعودی عرب کو حاصل ہے لیکن اس کا انحصار خود سعودی عرب میں دور رس تبدیلیوں پر ہے جتنی جلدی یہاں تبدیلیاں رونما ہوں گی اتنی ہی تیزی سے یہ اس تقریب کو اور اس تقریب کے موقع پر جمع ہونے والے حاجیوں کو متاثر کرے گی۔ اب حقیقت یہ ہے کہ یہاں سے حاجی عربوں سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ بد دل ہو کر جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج سعودی عرب کو "خدام الحرمین" ہونے کے ناطے سے جو اہمیت حاصل ہے اس کو امریکی مفادات خاص طور پر دنیائے اسلام اور دنیائے عرب میں خصوصی مفادات کی حفاظت اور مقابلۃً ترقی پسند حکومتوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں اور بین الاقوامی تنظیموں کو خصوصی مفادات کے لیے اور مسلمان ملکوں میں سوشلسٹ تحریکوں کے خلاف محاذ کے قیام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے جس طرح عیسائی دنیا میں پوپ کا اثر و رسوخ مغرب کی بالادستی کے لیے کھلم کھلا استعمال ہوتا ہے اسی طرح سعودی عرب رابطہ عالم اسلامی کے ذریعے مسلمان رجعت پسندوں اور ملاؤں کو منظم کرنے میں ممد ہو رہا ہے۔

اس وقت ظہر کی نماز ہونے والی ہے نماز گھر پر ہی ادا کریں گے۔ اس لیے کہ نیچے ہمارے مکان تک صفیں بندھ چکی ہیں اور اب گزرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں آج اشراق کے بعد شاہ فیصل حرم میں آئے اور انھوں نے بیت اللہ کو غسل دیا اور غلاف کعبہ تبدیل ہوا آج عالم یہ ہے کہ حرم شریف کے چاروں طرف جو سڑکیں جاتی ہیں وہ سب نمازیوں کی صفوں سے اٹی پڑی ہیں۔

معلم کو آج بقایا سات سو ریال دے آیا ہوں۔ اب تک تقریباً اٹھارہ سو ریال خرچ ہو چکے ہیں ابھی قربانی اور مدینہ کے قیام، آمد و رفت کا خرچ باقی رہتا ہے اور ابھی ایک مہینہ اس دیار میں گزارنا بھی ہے۔

عصر بھی گھر پر ہی پڑھی ہے، عائشہ البتہ اکیلی حرم شریف گئی ہے۔ اس کو آج قرآن شریف

ختم کرنا ہے اور وہاں دعائیں مانگنی ہیں۔ میں آج نہایا ہوں اور صبح کی روانگی کے لیے پورا اہتمام کیا ہے خیال تھا کہ WALKING SHOE پہن لوں گا لیکن معلوم ہوا کہ صرف ہوائی چپل ہی پہنی جا سکتی ہے وہ جوتا جس سے انگوٹھا اور پاؤں کی ہڈی چھپ جائے مسنون نہیں ہے۔

یہ اس دفعہ تمام ملکوں کے حاجیوں کی تعداد میں جو معتد بہ اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے یہ ایک اہم سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے کہ یہ مذہب کا احیاء ہو رہا ہے یا کیا ہے۔ کیونکہ بظاہر مذہبی احیاء کی کوئی عالمگیر تحریک تو ہے نہیں، پھر یہ حج پر آنے والوں میں اضافہ کیوں ہے؟ میرے نزدیک حج کے لیے یہ بے تابی، یہ جنون، دنیائے اسلام میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مظہر ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا ایک زبردست تبدیلی، انقلاب اور معاشی الٹ پلٹ کے دہانے پر کھڑی ہے اور تیسری دنیا اس تبدیلی اور انقلاب کی زد میں سب سے زیادہ ہے اور مسلمان ممالک اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن پچھلے پانچ چھ برس سے سماجی تبدیلیوں کی منظم تحریک کو سوویت روس اور جمہوریہ چین کے اختلافات نے کسی حد انتشار میں مبتلا کر دیا ہے جس کے نتیجے میں تیسری دنیا میں آزادی اور سوشلزم کی تحریکوں کو نقصان پہنچا ہے اور ان خطوں کے عوام ایک گونہ مایوسی کا شکار ہوتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ مایوسی مذہبی شیفتگی کو جنم دیتی ہے اور مذہب ایک گونہ لاشعوری طور پر واحد سہارا بن کر ابھرتا ہے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ جب بھی تیسری دنیا میں غربت و افلاس، پس ماندگی و ناخواندگی کا ذکر ہوتا ہے تو ملا ملانے ہی نہیں بلکہ ایک خاصا گروہ یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ ہم نے مذہب سے چونکہ ناطہ توڑ لیا ہے اس لیے ہم تنزل کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو کامیابیاں اور کامرانیاں ہمارے قدم چومیں گی۔ بہت سے لوگ خلوص اور دیانت سے یہ باتیں کرتے۔ لیکن ذرا ان باتوں کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ عملاً ایسی باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی غربت کی اصل وجوہات کا پتہ نہ چلا ئیں۔ ہم کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ تیسری دنیا کی پس ماندگی غربت اور افلاس کی اصل وجہ کیا ہے، سامراج اور سرمایہ داری

نظام نے کس طرح ہم کو لوٹا ہے اور آج بھی کس طرح ہماری ظاہری آزادی کے باوجود ہم معاشی طور پر کس طرح سامراج اور سرمایہ داری نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں۔

اگر صحیح معنوں میں مسلمان بننے کا مطلب یہ ہے کہ تمام عبادات اور مذہبی فرائض ادا کریں تو سعودی عرب میں پانچوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں حج بھی کرتے ہیں اور مقدس سرزمین پر آباد ہیں لیکن وہاں کی پس ماندگی پوری دنیا کو شرماتی ہے۔ تیل کی آمدن کے باوجود ہم سے بھی زیادہ پس ماندہ ہیں آخر کوئی وجہ تو ہوگی۔ اب ان وجوہات کا علم تو سماجی علوم کی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے اور سماجی علوم میں سب سے زیادہ اہم مارکسزم ہے جو سماج میں ہونیوالی تبدیلیوں کے علم کی سائنس ہے اس نسے یہ ہمارے عالم فاضل لوگ بدکتے ہیں اور اس کا نتیجہ عملاً کیا ہوتا ہے کہ ان کی مذہب دوستی STATUS QUO کا سب سے بڑا ہتھیار بن جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اور ہر خطے میں زمیندار، سرمایہ دار، سامراجی یہ سب بڑھ چڑھ کر مذہب سے شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں اور عوام کو مذہبی بھول بھلیوں میں الجھانے اور بے علم رکھنے کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کا نہ تو علم حاصل کریں نہ اس کے لیے آواز اٹھا سکیں یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں مولانا عبیداللہ سندھی نے علماء کی اس رجعت پسندانہ روش کے خلاف مہم چلائی اور تیسری دنیا میں آج بھی جہاں سماجی تبدیلیوں کے لیے لڑائیاں جاری ہیں وہاں کئی ایک مذہبی لوگ بھی ان لڑائیوں میں شامل ہو رہے ہیں مذہب کو اگر اس بدلتی ہوئی دنیا میں زندہ رہنا ہے تو اس کے نام لیواؤں کو اپنی انسان دوستی کا ثبوت دینا ہوگا۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ اس صدی کی تیسری چوتھی اور پانچویں دہائی میں کمیونزم کے لیے جو کشش اس روئے زمین کے مختلف ممالک میں موجود تھی اور دیس دیس کے لوگ اپنے اپنے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے پرچم تلے جو جہاد کر رہے تھے اس کی یلغار اب رک گئی ہے اور اب کمیونسٹ پارٹیوں کی مقبولیت کا وہ زور نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب افریقہ وغیرہ میں جو ہیجان اور تبدیلی کی خواہش ہے اس کو منظم کرنے کے لیے کوئی نمایاں طاقت موجود نہیں ہے

اس لیے لوگ روایتاً مذہب کی طرف پلٹ رہے ہیں اور عبادت پر زور دے رہے ہیں چنانچہ سعودی عرب اور شاہ فیصل اس خلاء کو محسوس کر رہے ہیں اور وہ اپنے مبلغوں کو افریقی ممالک میں بھیج رہے ہیں اور اپنے پیسے کے زور پر بھی ان کو مشرف بہ اسلام کیا جا رہا ہے اور چونکہ افریقہ میں کیا پورے ایشیا میں ابھی قبائلی نظام کی جڑیں بہت ہی گہری اور پختہ ہیں اس لیے ایک قبیلے کا سردار اگر اسلام قبول کر لیتا ہے تو پورا قبیلہ نیا مذہب قبول کر لیتا ہے چنانچہ میں نے یہاں کئی ایک افریقی قبائل کو آتے دیکھا ہے اور انکی آؤ بھگت بھی خاص طور پر کی جاتی ہے۔

۱۲/ جنوری

اس وقت نصف شب ہے اور یہاں کی پوری دنیا جاگ رہی ہے جاگ ہی نہیں رہی بلکہ پوری طرح سرگرم عمل ہے اور اس کی یہ سرگرمی پورے جوبن پہ ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی اور حج کی تقریبات کا آغاز پانی کے خاتمے سے ہوا ہے۔ عائشہ نہانے کے لیے تیار ہوئی تو پانی ندارد۔ اس وقت پورے مکّے میں غالباً یہی حال ہوگا۔ یہ سب پانی منیٰ کھینچ جاتا ہے اور یہاں وضو اور طہارت تک کے لیے پانی کی بوند نہیں۔ ہماری بلڈنگ میں کہرام مچا ہوا ہے۔ نیچے لوگ احرام باندھے بسوں پر لادے جا رہے ہیں کئی ایک بسوں پر اندر اور اُوپر دونوں جگہ سواریاں لدی ہوئی ہیں۔ یہ بسیں ابھی سے حاجیوں کو لے کر جانا شروع ہو گئی ہیں حالانکہ سنت یہ ہے کہ سورج طلوع ہونے کے بعد اشراق کی نماز ادا کرنے کے بعد روانہ ہونا چاہیے۔ اب اس ہجوم اور اس سنت کا تصادم ہے۔ اگر سب حاجی اشراق کے بعد چلنا شروع کریں تو سورج کے غروب ہونے تک بھی غالباً منیٰ نہ پہنچ سکیں گے اس ضمن میں اعداد و شمار اکٹھے کروں گا کہ کتنی بسیں، کتنی ٹیکسیاں استعمال ہوئی ہیں، کتنے حاجی پیدل گئے ہیں۔

مالک مکان کو ہمارے ہمسایوں نے جا کر مجبور کیا تو اس نے مشین چلا دی جس سے پانی آنا شروع ہوا ہے اور عائشہ نے غسل کیا ہے اور میں نے وضو کیا ہے ہم سامان باندھ کر تیار ہیں اور پراٹھے اور آملیٹ بھی بنا لیا ہے۔ ان سے آج کا دن کٹ جائے گا۔ ویسے میرا گلا بھی رات سے سخت درد کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خشک میوہ اور کھجوریں کھانے سے گلا دکھنے لگا ہے، اسپرو کی دو گولیاں کھائی ہیں گلا ہنوز دکھ رہا ہے، عائشہ تیار ہو گئی ہے۔ عورتوں کے لیے لباس میں قدرے آسانی ہے ان کو صرف اُوپر سفید چادر لینی ہے لیکن ہم کو اوپر تلے سفید چادروں میں ملبوس ہونا ہے۔

فجر کی نماز ادا کر چکے احرام باندھ لیے ہیں اور احرام کے نوافل بھی پڑھ لیے۔ اب رخت سفر بندھ چکا ہے اب چلنے کو ہیں۔ ساتھ کے ہمسایہ معلم سے پوچھنے کے لیے گئے ہیں کہ کس وقت چلنا ہے احرام باندھتے وقت کی جو نیت ہے وہ بہت ہی معنی خیز ہے۔

اے اللہ میں حج کی نیت کرتا ہوں۔
پس اس کو میرے لیے آسان کر دے۔
اور مجھ سے قبول کر لے۔
اور اس میں میری مدد فرما۔
اور اس میں میرے لیے برکت ڈال دے۔
میں نے حج کی نیت کی اور اس کا احرام باندھا اللہ کے لیے۔

یہ منیٰ ہے مکہ سے تقریباً دو تین میل دور ہے اس کا لفظی ترجمہ میلہ یا قربانی و آزمائش کی جگہ کے ہیں ویسے یہ پورا علاقہ اور خطہ حرم کی حدود میں ہی تصور ہوتا ہے اس کی حد وادی محسر سے جمرہ عقبیٰ تک ہے اس کا طول دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان تقریباً دو تین میل ہے آج یہ پورا خطہ، پورا علاقہ، پورا منیٰ خیموں کا شہر بنا ہوا ہے، سڑکوں، شاہراہوں، پہاڑیوں، پگڈنڈیوں پر جہاں تک بھی نظر جا سکتی ہے وہاں خیمے، چھولداریاں اور تنبو نظر آتے ہیں۔ اس لق و دق صحرا میں آج انسانوں کا جم غفیر ہے اور جسے جہاں بھی جگہ مل جائے وہ وہیں پر بسیرا کرنے کے لیے تیار ہے۔ آج آرام کو تج دینے کا دن ہے آج آسائش سے منہ موڑنے کا جذبہ

بے قرار ہے آج انسان اپنے سے بے نیاز ہے اور کیف و مستی کا دور دورہ ہے اور میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

اسی کیف و مستی اور بے خودی کے عالم میں ہم بسوں سے اترے تو ہمیں زندگی کی حقیقتیں اور تلخیاں منہ کھولے سامنے کھڑی نظر آئیں اور شور، ہنگامے اور جگہ کی تلاش نے تمام مستیوں اور بے خودی کے آبگینے چکنا چور کر دیے اور قدم قدم پر بہ دوئی، یہ عبادت، یہ کیف، یہ جذبہ اور پھر کشاکش روزگار، انسانی کمینگیاں، خود غرضیاں، کہنی مار کر آگے بڑھنا، یہ سب مجھے بہت پریشان کر رہی تھیں۔

نہ اس کا وصل ہے ممکن نہ تاب ہے مجھ کو
عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے مجھ کو

اب سب سے بڑا مسئلہ قیام کے لیے جگہ کی تلاش تھی یہ بظاہر معلم کی ذمہ داری تھی اور ہم کو بھی معلم نے جگہ دینی ہے لیکن یہاں اسی کو جگہ مل رہی ہے جو دھینگا مشتی کر سکے۔ چنانچہ معلم بھی حیران و پریشان ہیں۔ ہم اس وقت سڑک پر بیٹھے ہیں۔ ہم تین خواتین اور تین مرد ہیں یہاں تک آنے میں کوئی زیادہ پریشانی نہیں ہوتی، نہ ہی کوئی زیادہ دھکم پیل ہوئی ہے۔ لیکن اب یہاں صورت حال ابھی تو پریشانی کا موجب ہے۔

آج صبح سے کیفیت رقت آمیز ہے۔ دعائیں کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ سفر آسان کر دے اور قبول کر لے۔ باقی حج نام ہے تکلیفوں کا۔ میں کسی حاجی کے بستر پر بیٹھا تھا کہ اس نے آ کر مجھے اٹھا دیا چنانچہ اب سڑک پر بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

نشیمن پھونکنے والے اب اپنی زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

اس وقت جس سڑک کے کنارے بیٹھا ہوں وہ شیطان روڈ یعنی شارع جمرہ کہلاتی ہے

اور سامنے STAND BY HOSPITAL ہے۔

جمعہ کی نماز میں تقریباً بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں نے مسجد حنیف میں نماز ادا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ہجوم کی وجہ سے ادائیگی نماز قریب قریب ناممکن ہوگئی اور اسی دھکم پیل میں میری چپل بھی ٹوٹ گئی اس کے بعد نئی چپل خریدی اور خیمے میں واپس آگیا ہمیں خیمہ مل گیا ہے اور اس میں ہم چھ آدمی ہیں تین مرد اور تین عورتیں اس خیمے پر کئی ایک حاجیوں نے دھاوا بولا لیکن میں نے کسی نہ کسی طریقے سے اس یلغار کو روک لیا۔ جب میں مسجد حنیف کو جارہا تھا تو راستے میں بلال کا سالا صدیق اور سرفراز مل گئے۔ مجھے کل رات سے گلے میں جو درد تھا وہ اب پورے زور کے انفلوئنزا میں تبدیل ہوگیا ہے اور اس وقت میں کیمپ میں لیٹا ہوں۔ جمعہ کی دو رکعت یہیں پر پڑھیں اس کے بعد اسپرو کی دو گولیاں کھا کے لیٹ گیا۔ اب گلا قدرے بہتر ہے۔ اس وقت با بہ سخت تپتی ہوئی دھوپ ہے لیکن ہوا چل رہی ہے جس سے پسینہ نہیں آتا اور خیمہ میں سکون ملتا ہے کل صبح تک یہیں اس میدان میں جہاں پانی کی بھی قلت ہے اور پیشاب پاخانے کی بھی تکلیف ہے گزر بسر کرنی ہے ویسے یہ تکلیفیں تو تین دن مزید برداشت کرنی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جاتی ہے کہ اے اللہ میرا یہ سفر آسان کر دے۔

عائشہ کو چائے کی طلب ہے میرے ہمسفر مرد باہر گئے ہوتے ہیں۔ وہ آجاتے ہیں تو پھر عائشہ کو لے کر باہر جاتا ہوں اور سیر بھی کرالاؤں گا اور چائے بھی پلواؤں گا۔ میں یہاں خیمے میں بیٹھا اس کیفیت پر غور کر رہا ہوں جو مجھ پر طاری ہوئی۔ میں اس وقت اس انکساری، اس گریہ زاری کا اظہار نہیں کر سکتا جس کا اظہار آج جب منیٰ کے لیے بس چلی تو مجھ سے ہوا۔ یہ بے ساختہ تھی اور روتے روتے اللہ تعالےٰ سے بخشش مانگتے مانگتے میری ہچکی بندھ گئی اور آواز رندھ گئی۔ اور مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے تو پختہ اعتقاد والوں کی حالت مجھ سے کہیں زیادہ دگرگوں ہونی چاہیے۔

وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو

حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

دراصل یہی وہ کیفیت ہے جو غالباً رسول اللہ حج کی ان تقریبات سے پیدا کرنا چاہتے تھے ان کا مقصد انسان کے جذبۂ عبودیت اور پرستش کو اتنا گرمانا تھا کہ اس کے بعد اس کو جس طرف چاہے موڑا جا سکے چنانچہ رسول اللہ نے حج کے موقع پر جو خطبات دیے ان سے ان مقاصد کا اظہار پوری طرح ہوتا ہے یہ حج کا مقصد قریب قریب وہی ہے جو سیاسی جماعتوں کا اپنی سالانہ کانفرنسوں یا جلسوں سے ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سالانہ جلسوں کی کیا صورت ہوا کرتی تھی یہی کہ کسی دور افتادہ گاؤں میں اجلاس کی تیاریاں ہوتیں وہاں باقاعدہ ایک شہر آباد کیا جاتا۔ چھولداریاں لگتیں جس میں مندوبین اور مبصرین کے قیام کا انتظام ہوتا پھر پنڈال لگتا جس میں اجلاس منعقد ہوتے، بازار لگتے، میلے ہوتے نمائشیں ترتیب دی جاتیں غرضیکہ ایک گاؤں جسے کوئی اہمیت نہ ہوتی وہ دیکھتے ہی دیکھتے سیاست کے نقشے پر اہمیت اختیار کر جاتا۔ تری پورہ ہو یا رام گڑھ یہی حالت تھی اور ایک وقت میں منیٰ اور عرفات کا بھی یہی عالم ہوگا۔ لیکن یہ مذہب کے نقشے پر ایسے ابھرے کہ ہزاروں برس کے بعد بھی ان کی اہمیت کو گھن نہیں لگا بلکہ مقبولیت و اہمیت کا آفتاب نصف النہار پر چڑھتا جا رہا ہے اور ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود سنت ابراہیمی کا وہ جوش اور جنون سرد نہیں پڑا۔ آج بھی وہی ولولہ ہر مسلمان کے اندر زندہ و پائندہ نظر آتا ہے۔ منیٰ میں ویسے کوئی مستقل آبادی نہیں۔ بڑے بڑے مکان کھڑے ہیں اور اب تو کئی کئی منزلہ جدید ترین طرز کے ہوٹل بنتے جا رہے ہیں اور ان میں نئے زمانے کی تمام آسائشیں و آرام اور ضرورتیں میسر ہیں لیکن یہاں صرف حج کے پانچ دنوں میں رونق ہوتی ہے اور یہاں کے مکین ان پانچ دنوں میں سال بھر کے لیے روزی کما لیتے ہیں، چنانچہ جب لوگ عمرے کے لیے آتے ہیں تو یہاں وہ رونق نہیں ہوتی اور یہ سب بازار اور دکانیں بند پڑی ہوتی ہیں، ہوٹل سنسان ہوتے ہیں اور یہاں پر ایک طرح سے ہُو کا عالم ہوتا ہے۔

عصر کی نماز کو تقریباً پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ عصر کی نماز خیمے میں ہی ادا کی۔ ان خیموں کے

شہر کا میں ذرا نقشہ کھینچ لوں، یہ منیٰ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ بالکل پتھریلے اور بے آب گیاہ ہیں۔ درمیان میں وادی سے کہیں زیادہ ریتلا سا میدان ہے جس میں تمام معلم اپنے خیمے لگاتے ہیں۔ یہ خیمے اچھے بھی ہوتے ہیں اور خراب بھی۔ آرام دہ بھی ہوتے ہیں اور بے آرام بھی پانی کی قلت یہاں کا معمول ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی کہرام مچنا شروع ہو گیا ہے۔ اور پانی کے لیے ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ جن خیموں میں ہم ہیں وہاں کے تمام حاجی معلم کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں کیونکہ ہمارے خیموں میں نہ پانی ہے نہ روشنی درمیان میں جو راستہ ہے اس میں بھی کوئی روشنی کا انتظام نہیں چنانچہ اب حاجی مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمیں تیس ریال واپس کیے جائیں کیونکہ ہم سے جو ساٹھ ریال فی حاجی لیے گئے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں حالانکہ باقی معلموں نے عام طور پر تیس ریال ہی لیے ہیں۔

عصر کے بعد میں اور عائشہ باہر نکلے کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ بہت مشکل سے شارع حنیف تک پہنچے وہاں سے شارع جمرہ پر آئے۔ دکانوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں میلے کا سماں تھا۔ احرام باندھے لوگ کھا پی رہے تھے۔ ہم عمر اکبر معلم کے خیموں میں گئے۔ وہاں بلال کے خاندان اور ان کے متعلقین سے ملاقات کی اور وہاں بیٹھ کر گپ کرتے رہے۔ بالکل چراغوں کے میلے پر رات کو نوابوں کے جو خیمے ہوتے تھے وہی صورت حال وہاں تھی۔ گدے قالین بچھے ہوئے۔ تکیے لگے ہوئے، کوکاکولا اور سیون اپ کے دور چل رہے تھے۔ ہم بھی ان سے نوازے گئے وہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ کوثر نیازی مع بعض افراد ڈیلیگیشن کے معائنے کے لیے گزرتے ہوئے آگئے۔ گلے ملے، عائشہ سے کہا کہ بیوی بچے آئے ہوئے ہیں۔ ان سے آکر مل لیجیے۔ وہاں سے ہم بھی تھوڑی دیر بعد نکلے۔ راستے میں چائے پی اور کلینیز کا ڈبہ لیا اور واپس خیمے میں آگئے۔ پھر شام کی نماز کے بعد میرے گلے میں درد اور زکام کی شدت ہو گئی اور وہیں اسپرو کھا کر لیٹ گیا لیکن اتنے میں ہمارے ہمسفر اجمل اور ڈاکٹر سعید اور ان کا ایک رفیق مرزا آگئے ان کو بھی اپنی سیٹیں پہلے بک کروانی ہیں۔ چنانچہ عائشہ سمیت ہم کوثر نیازی اور ڈیلیگیشن کو ملنے کے لیے ان کے کمرے میں چلے گئے اور میں مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی

مولانا عبدالحکیم وغیرہ اور دوسرے لوگوں سے گپ کرتا رہا۔ کچھ پاکستان کے حالات معلوم کیے۔ معلوم ہوتا ہے ولی خان اور عبدالغفار خاں سے بھٹو خوش نہیں بلکہ پریشان ہے یہاں ہوائی جہاز کی نشستوں کے ردوبدل کے لیے کئی مسائل موجود تھے۔ خیر ہم ایک دو سے بات کر کے آگئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام فیصلے پرسوں قربانی کے بعد ہی ہونگے رات کو دیر سے واپس آئے

۱۳/ جنوری

ہفتے کا دن ہے میں حج کی ادائیگی کے لیے عرفات کے میدان میں پہنچ چکا ہوں۔ یہ میدان جو لق ودق صحرا ہے وہی میدان ہے جہاں آدم وحوا کا ایک مدت کے بعد ملاپ ہوا تھا اور اسی ملاپ اور توبہ کی قبولیت کی یاد میں یہ تقریب ہے اور یہیں اسی میدان میں قیام کرنا اور ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کرنا اور مغرب کی نماز تک دعائیں مانگنا یہی حج ہے۔ آج کی گریہ زاری، بخشش کے لیے دعا یہ اس تقریب کی جان ہے عرفات کے اس میدان کے ساتھ کئی ایک روایات وابستہ ہیں مثال کے طور پر یہ بھی روایت ہے کہ محشر کا میدان بھی یہی عرفات کا لق ودق صحرا ہوگا۔

رات جو منیٰ میں گزاری ایسی رات بہت دنوں کے بعد گزاری عملی سیاست کے زمانے میں کانفرنسوں کے دوران ایسی راتیں گزارنی پڑتی تھیں ایسی سخت زمین پر ایک چادر بچھا کر سونا پڑتا تھا۔ چنانچہ رات بھی ہم کو زمین پر سونا پڑا نیچے روڑے کنکر سبھی کچھ تھا۔ اوپر ایک دری اور عائشہ کا کوٹ اوپر بچھا لیا تھا۔ عائشہ بے چاری کے نیچے تو صرف بستر بند ہی تھا لیکن رات نیند تھوڑی بہت آگئی مگر تمام رات ناک سے پانی بہتا رہا اور سانس بند ہو جاتا رہا۔ ایک دو دفعہ دوائی ڈالی تو سانس ٹھیک ہوا رات دو تین دفعہ اٹھا ایک بار پیشاب کے لیے گیا ویسے اکثر و بیشتر نصف شب سے ہی بیدار ہو چکا تھا اور نوافل اور دعائیں کرتے رہے علی الصبح فجر کی نماز کے بعد ایک ایک

دری اور کمبل تھام کر عرفات روانہ ہوئے عرفات منٰی سے سات میل دور ہے لیکن ہمیں یہاں بس میں پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لگا۔ یہاں چار سڑکیں ہیں اور کافی کشادہ ہیں۔ ٹریفک کا انتظام خاصا بہتر ہے لیکن ایک ایسا منظر تھا جیسے پوری آبادی اپنا سامان اٹھائے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہی ہے کوئی بس پر تھا کوئی ٹرک ہیں، کوئی ٹیکسی ہیں اور ایک مخلوق پیدل بھی رواں دواں تھی آج ہر ایک پر عبادت کرنے کی کیفیت طاری ہے اور اب سائبان کے نیچے سب حاجی بیٹھے ہیں۔ صبح سویاں اور چائے سرکاری طور پر دی گئی ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی معلم ہی کی طرف سے دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ناشتہ اور حج کا کھانا حکومت کی طرف سے کھلایا جاتا ہے

عصر کا وقت ہو رہا ہے لیکن عصر تو ظہر کے ساتھ ہی آج ادا کر لی آج صبح کی تقریب مسجد حمزہ کے گرد ہر میدان، ہر راستے، ہر موڑ، ہر بس، ہر پہاڑی، ہر پگڈنڈی پر احرام باندھے خطیب کا خطبہ سن رہے تھے اور وہ رو رہے تھے گریہ وزاری کر رہے تھے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے یہ عجب سماں تھا کہ کوئی آنکھ نہ تھی جو پرنم نہ ہو۔ میری آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ میں بھی رو رہا تھا، اس چیز سے بے نیاز کہ اعتقادات کیا ہیں اور کیا نہیں۔

کیا کوئی کہے اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے
ہاتھ آئے تو بت ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

لیکن یہاں پر میری کیفیت یہی رہی ہے اور وقفے وقفے کے بعد رقت طاری ہو جاتی رہی پوری فضا ہی ایسی تھی لیکن اس فضا میں بھی تضاد تھا۔ ایک طرف گناہوں کی معافی تھی۔ اپنی تلخیوں اور محرومیوں کے ازالے کے لیے دعائیں تھیں دوسری طرف پانی کے لیے جھگڑے تھے جگہ کے لیے اصرار تھا۔ غرضیکہ نیکی اور بدی کا تصادم بھی موجود تھا۔ لیکن اگر کوئی شخصیت ہو۔ تنظیم ہو تو وہ اس موقع پر انسانوں کے نیکی کے جذبے کو مہمیز لگا کر بدی کو شکست دے سکتی ہے۔

میں جب خطیب کا خطبہ سورج کی تمازت میں بیٹھا سن رہا تھا تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر آخری خطبہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا۔

"آج جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں. تمھارا رب ایک ہے اور لاشریک ہے. آج سے عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سیاہ کو سُرخ پر اور سرخ کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ اِلا باالتقوٰی."

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے تمھارے غلام! تمھارے غلام جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ جو خود پہنو ان کو پہناؤ، جاہلیت کے تمام سود باطل کردیے گئے ہیں، میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس کا سود معاف کرتا ہوں۔عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے. تمھارا خون اور تمھارا مال تاقیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔"

"مَیں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں جسے تم نے مضبوطی سے پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے ؟ کتاب اللہ، خدا نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا، اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو۔ زنا کار کے لیے پتھر ہے اور اس کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔"

فرمایا۔

لوگو! تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا۔ کیا جواب دو گے؟

مجمع پکارتا ہے۔

"ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔"

اس وقت کلام الٰہی کی آخری آیت اتری۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔"

"آج میں نے تمھارے لیے دین مکمل کر دیا ، اپنی نعمت تمام کر دی اور

تمھارے لیے اسلام کو دین منتخب کرلیا۔"

اب اگر اس خطبے پر غور کیا جائے تو کس طرح اس وقت کے مظلوم اور پسے ہوتے طبقوں کو مژدہ جانفزا سناتا ہے۔ اور یہ اس وقت کا انقلاب اور تبدیلی کا پیغام تھا اس وقت کا سب سے مظلوم طبقہ جو سب سے اہم ذریعہ پیداوار تھا وہ غلام تھا، درست ہے کہ اسلام نے غلامی کو بالکل متروک قرار نہیں دیا۔ لیکن غلام کو ایک نئی حیثیت اور بہتر مقام ضرور بخشا اور پھر انسانی اخوت اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا پیغام لے کر یہ عرب جہاں بھی پہنچے وہاں کی سلطنتوں کو سرنگوں کیا کیونکہ یہ ان سلطنتوں میں بسنے والے مظلوموں کے لیے ایک مژدہ جانفزا تھا۔ ان کی مادی زندگیوں میں انقلاب کی نوید تھی۔ یہ ان کی محرومیوں کا مداوا تھا۔ یہ ان کی تلخیوں سے نجات کا پیغام تھا۔ اس پیغام کو انھوں نے اپنی روح کے لیے نہیں بلکہ اپنی مادی زندگی کی آسائشوں اور اس میں تبدیلی کے لیے قبول کیا تھا۔ اور ان کی روحانی زندگی میں تبدیلی بعد میں آئی تھی۔ یہ ٹھوس حقائق ہیں۔ میں انہی حقائق کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سالہا سال سے تاویلوں کی کتنی دبیز تہیں ان حقائق کے اُوپر چڑھا دی گئی ہیں اور ٹھوس حقیقتوں کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ٹھوس حقائق سامنے آئیں تو پھر سماجی تبدیلیوں کی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔

اب یہاں سے وداع ہونے کا وقت آرہا ہے۔ یہاں تکلیفیں تھیں، صعوبتیں تھیں ننگی زمین تھی، یہ سب کچھ تھا۔ لیکن اسکے باوجود لوگ ہیں کہ یہاں سے رخصت ہوتے ہوتے پریشان ہو رہے ہیں، رو رہے ہیں۔ میرا بھی حال مختلف نہیں ہے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

لوگ بستر باندھ کر اور سامان لے کر بسوں میں جگہ لینے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ اب یہاں سے مزدلفہ روانگی ہے۔ رات وہیں بسر کرنی ہے۔ یہ رات خاصی سختی اور امتحان کی

رات ہے۔ ویسے آج حج کی تقریب مکمل ہو گئی اب حج کی تکمیل کے لیے صرف طواف بیت اللہ کی تقریب کی ادائیگی باقی رہ گئی ہے۔ جب بھی وہ مکمل کر لی جائے تو حج مکمل ہو جاتا ہے۔ دو ہنگامہ پرور دن گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دن بخیر و خوبی گزار دیے۔ باقی دن بھی گزر جائیں تو اطمینان ہو کہ اپنے گھر واپس پہنچیں۔ اب تو اپنے شہر، اپنے لوگوں کی یاد بُری طرح ستانے لگی ہے۔ وہ گلی وہ کوچے، وہ محفلیں سب یاد آ رہی ہیں۔

کون چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پائے

۱۴ر جنوری

آج حج کی دسویں ہے اور یہاں اتوار ہے۔ یہ عیدالضحیٰ ہے لیکن میں ابھی تک ایک سطر نہیں لکھ سکا۔ اس وقت جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو سعودی عرب کے وقت کے مطابق ۱/۲ ۷ بجے ہیں اور میں ظہر کی نماز پڑھ کے ابھی فارغ ہوا ہوں کل غروب آفتاب سے لے کر اس وقت تک اتنی ہنگامہ پرور اور متحرک زندگی رہی ہے کہ نہ فرصت ہی ملی اور نہ ہی موقع۔ اگرچہ چند منٹ کا موقعہ ملا تو تھکان اتنی تھی کہ لکھنے کو جی ہی نہیں چاہا۔

۱۳ر جنوری یعنی حج کی نویں کو غروب آفتاب کے قریب عرفات کے میدان میں بلند آواز دعاؤں گریہ زاری اور چیختے دھاڑتے لوگ بسوں میں بیٹھے اور مزدلفہ کو روانہ ہوئے ویسے عرفات سے مزدلفہ کا فاصلہ چار میل ہے لیکن یہ فاصلہ جب سولہ لاکھ انسانوں نے طے کرنا ہو اور ہزاروں بسیں، ہزاروں ٹیکسیاں، ہزاروں منی بسیں اور لاکھوں پیدل چلنے والے ہوں تو پھر یہ فاصلہ آسانی سے کیسے طے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم کوئی چار گھنٹے کے تھکا دینے والے ہچکولوں اور بسوں میں بیٹھنے کے بعد مزدلفہ پہنچے لیکن ہمارے بس کے ڈرائیور نے ہجوم سے بچنے کے لیے بس کو مزدلفہ سے گزار منیٰ کے

حدود میں اتار دیا اس پر حاجی حضرات سیخ پا ہو گئے اور پھر بس میں سوار ہو سامان رکھ بس میں بیٹھ مزدلفہ پہنچے تو عشاء کا بھی وقت ہو چکا تھا وہاں مغرب اور عشاء ملا کر پڑھیں، یہ مزدلفہ ایک بنجر بیابان کا نام ہے جہاں کی زمین ٹیلوں سے بھر پور کنکریالی ہے۔ یہاں رسولؐ اللہ نے حج کے بعد قیام فرمایا تھا چنانچہ تب سے سنت ہے اور حاجی کے لیے یہاں رات کا قیام فرض ہے یہیں سے کنکریاں چنی جاتی ہیں جو شیاطین پر ماری جاتی ہیں چنانچہ میں نے بھی اپنے اور عائشہ کے لیے کنکریاں چنیں۔ اب حاجی حضرات اور بس ڈرائیور میں تو تکار ہو رہی تھی بس ڈرائیور یہ کہہ رہا تھا کہ میں منیٰ جا رہا ہوں۔ حاجی کہہ رہے تھے کہ وہ بس کو نہیں جانے دیں گے کیونکہ ان کو حب تنہ خدشہ تھا کہ صبح ان کو مزدلفہ سے منیٰ لے جانے کے لیے کوئی بس نہیں آئے گی چنانچہ حاجی حضرات کچھ بس کے آگے لیٹ گئے اور کچھ پیچھے خاصی گالی گلوچ ہوئی۔ لوگوں نے اپنے سامان اتار کر مزدلفہ کے اندھیرے میدان جس پر صرف دسویں کے چاند کی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی بستر بچھا دیے تھے کئی ایک کھانا کھا رہے تھے گویا پکنک کا سماں تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں شروع میں ہوا کی خنکی بہت ہی اچھی لگتی تھی لیکن چند منٹ کے بعد سخت سردی لگنے لگی ہم تو اپنے ساتھ سامان لے کر ہی نہیں گئے تھے ایک دری اور کمبل تھا یہی عائشہ کا سامان تھا اور یہی میرا۔ خیال یہی تھا کہ پیدل چلنا پڑے گا۔ لیکن اب رات کو جب سردی پڑنی شروع ہوئی تو کپکپی شروع ہوئی۔ عائشہ نے باہر جا کر لیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن سردی نے جب پریشان کرنا شروع کر دیا تو پھر واپس آ گئی میں شروع میں ہی بس کے اندر خالی سیٹ پر لیٹ گیا اس کی وجہ سے کچھ نیند آ گئی۔ لیکن عائشہ خاصی پریشان رہی اور آخر شب تھوڑا سا سستائی۔

تہجد سے بھی پہلے ہم چاق وچوبند ہو گئے اور باہر سے مسافر بس میں آنے شروع ہوئے اور اس کے بعد بس کے چلنے تک آپس میں نشستوں کے لیے خاصی تو تکار رہی۔ یہ حاجی کی گریہ وزاری، الحاجت نرمی اور رحمدلی کا ایک پہلو تھا اور جب یہ لڑتے ہیں اور تو تکار کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی رعایتوں کے لیے جب گتھم گتھا ہوتے ہیں تو یہ دوسرا پہلو ہوتا ہے۔

فجر کی نماز کے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ڈرائیور آیا اور جو ڈر تھا کہ وہ اب آئے گا ہی نہیں دور ہوا اس

نے اب بخشش کا مطالبہ شروع کیا چنانچہ کچھ ریال اس کو دیے گئے اور وہاں سے بس چلنا شروع ہوئی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں ہم منیٰ پہنچے وہاں سے ہم اپنے خیمے میں تقریباً ایک گھنٹہ میں پہنچے ہجوم اور دھکم پیل کا جو عالم تھا الحفیظ والامان۔ لیکن ان دنوں کے منظر میں ایک روحانیت بھی تھی ایک حسن بھی تھا ایک دلفریبی تھی۔ مثلاً عرفات کا میدان ہو یا منیٰ کا قصبہ یا پھر مزدلفہ کا پتھریلی کنکریوں اور ٹیلوں سے اٹا ہوا لق ودق صحرا یہ سب انسانوں کے بحر بیکراں نظر آتے تھے رات کو مزدلفہ کے اندھیرے میں کہیں کہیں بتی یا گیس کی روشنی ایسی معلوم ہوتی جیسے انسانوں کے درمیان جگنو چمک رہا ہو، بسیں تھیں ان کے اردگرد مرد عورتیں اور بچے دراز تھے کچھ کے پاس بستر تھے اور کچھ ویسے ہی احرام میں گٹھڑی بنے ہوتے تھے شدید سردی ان کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھی، عرفات کا میدان، خیموں اور بسوں، ٹیکسیوں، موٹروں کا شہر نظر آتا۔ جدھر نظر جاتی تھی ادھر خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے اور باقاعدہ شہر آباد ہو گیا تھا۔ دکانیں سجی ہوئی، چائے خانے موجود تھے، پھل والے بھی آوازیں لگا رہے تھے جنرل مرچنٹ بھی آ موجود ہوتے تھے اور منیٰ کا قصبہ جس میں اب فلک بوس عمارتیں اور ہوٹل بننے شروع ہو گئے ہیں وہ تو روشنیوں کا شہر بن رہا تھا۔ بالکل دلہن کا گھر دکھائی دیتا تھا لیکن تھکان تھی کہ وہ ان سب مناظر سے بیزار کر رہی تھی اور زندگی اتنی متحرک اور تیز تھی کہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ عائشہ اندر اندر ہی اکتائی ہوئی دکھائی دیتی تھی بالآخر وہ کہنے لگی کہ اب میں اپنے گھر سے کبھی نہیں نکلوں گی۔

حج کے دوران جو مصائب، پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا ذکر کوئی کھل کر نہیں کرتا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ حج کی نفی ہے کیونکہ اس کو یہ سکھایا گیا ہے کہ حج نام ہی تکلیفوں اور مصائب جھیلنے کا ہے ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اور اس سے زیادہ سہل اور آسان مذہب کوئی نہیں دوسری طرف یہ اذیت کوشی کے جذبے کو پروان چڑھایا جاتا ہے اب طواف ہوں یا حرم میں نمازیں ادا کرنا، یا پھر شیطان کو کنکر مارنے کے لیے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا یہ سب اذیت کوشیاں نہیں تو اور کیا ہیں چنانچہ بس میں بیٹھے مزدلفہ سے جب ہم آ رہے تھے تو سبھی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے کہ یہ دسویں کا دن خیریت سے گزر جاتے اور حج کے بقایا

فرائض پورے ہو جائیں میں سمجھ رہا تھا کہ شاید میں ہی ان ہنگاموں سے ڈر رہا ہوں لیکن جب کسی سے بات کی تو سبھی سہمے ہوئے تھے اور ہر کسی کے لبوں پر یہی دعا تھی کہ اے اللہ میرا حج آسان فرمادے اور قبول کرلے۔ اب یہ فرائض کیا تھے جو آپ کو ہر حال میں آج ہی ادا کرنے ہیں۔

۱:۔ طلوع آفتاب سے لے کر غروب تک جمرۂ عقبہ یعنی شیطان نمبر ایک پر سات کنکریاں مارنا۔

۲:۔ مذبح میں جاکر جانور خریدنا اور وہیں اس کو قربان کرنا۔

۳:۔ سر منڈوانا۔

۴:۔ مکے میں جاکر بیت اللہ کا طواف کرنا جو سات چکروں پر مشتمل ہوگا۔

۵:۔ صفا اور مروہ کا طواف وہ بھی سات چکروں پر مشتمل ہوگا۔

۶:۔ رات کو واپس آنا اور منیٰ میں قیام کرنا۔ اب ہم طلوع آفتاب کے بعد واپس اپنے خیمے میں پہنچے، سامان رکھا اس کے بعد پیشاب کیا اور میں عائشہ کو لے کر چائے خانہ گیا وہاں ہم نے چائے کے دو گلاس اور ایک نان لیا اور اس سے ناشتہ کیا۔ ناشتہ کر کے واپس آئے اور ہم مرد کمریں کس کر شیطان کو کنکریاں مارنے کے لیے خیمہ سے نکلے میں ننگے پاؤں تھا۔ گھڑی بھی اتار دی تھی عینک بھی اتار دی اور احرام کی اوپر کی چادر کمر میں کس کر باندھ لی بالکل جیسے پہلوان اکھاڑے میں اترنے جا رہا ہو۔ چنانچہ ہم چلے۔ دراصل سب کو افریقیوں سے بہت ڈر لگنے لگا تھا کہ وہ لوگوں کو روند ڈالیں گے اسلیے کہ ایک تو ان کے ڈیل ڈول تمام ممالک کے لوگوں سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم اور دیو ہیکل ہوتے ہیں اور وہ چال ڈھال میں ایک خیل مست دکھائی دیتے ہیں جو دائیں بائیں روندتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس جھم کی وجہ سے عورتوں کی بڑی تعداد نے یہ کنکر مارنے سے اجتناب کیا اور اپنے مردوں کو وکیل بنا دیا۔ حالانکہ مذہبی طور پر یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ بہر حال ہم خواتین کو چھوڑ کر اکیلے ہی چلے لیکن ہم جب چلے تو اس وقت ہجوم قدرے کم تھا اور غیر شعوری طور پر لوگوں نے ایک ضبط پیدا کر لیا تھا یعنی سڑک کے

ایک کنارے جانے والوں کا بحرِ بیکراں آہستہ آہستہ موج در موج بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف واپس آنے والوں کی قطاریں بنی ہوتی تھیں ابھی یہ صبح تھی اس لیے بہت بھاری اکثریت تو ابھی مزدلفہ سے واپس منیٰ ہی نہیں آئی تھی اور جو پہنچے تھے وہ ابھی شریک نہیں ہوتے اس لیے ہم خدا خدا کر کے اس فریضہ سے بغیر کسی بھاری پریشانی کے فارغ ہو گئے جس وقت یہ فراغت ہوئی تو بے حد خوشی ہوئی کیونکہ اس تقریب نے خاصا ہراساں کر رکھا تھا یہاں سے واپس آئے اور خواتین کو مبارک دی کہ ان کا بھی یہ فرض پورا ہو گیا ہے۔ باقی اس کے بعد پندرہ بیس منٹ آرام کیا اور قربانی کے لیے آمادۂ سفر ہو گئے۔ ایک گھنٹے کی تگ و دو اور دھکم پیل کے بعد مذبح خانہ کے قریب پہنچے تو آوازیں آ رہی تھیں کہ راستے ہجوم کی وجہ سے مسدود ہیں یہ ایک گھنٹہ جس پریشانی اور ہجوم کے ریلوں میں گزرا اس کو قلم بند کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ واپس چلیں اور یہ فرض دوسرے دن یعنی گیارہویں کو پورا کیا جائے خیمے میں واپس آ گئے اور اپنی اپنی جگہ خاصے پریشان تھے کہ اتنے میں مرزا طاہر بیگ آ گئے۔ یہ ہمارے ہم خیمہ لوگوں کے دوست اور عزیز اور بے حد ہنس مکھ، دلچسپ، طناز اور لطیفہ گو ہے اور وہ ایسے ہجوم میں گھسنے کا ماہر ہے چنانچہ وہ اور ہمارے ہم خیمہ خاندان کے سربراہ ڈاکٹر سعید گئے اور دو گھنٹے کے بعد کامیاب و کامران واپس آئے ہم سب نے مل کر ایک گائے خریدی اور اس کی قربانی دی تھی ان کے کپڑے اور جوتے خون سے لت پت تھے اور تھکن سے چور لیکن بہر حال ان تمام تکلیفوں کے باوجود کامیابی نے مسرور بنا دیا کہ یہ فرض بھی پورا ہو گیا اس کے بعد ہم عصر کے قریب مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ سٹیشن ویگن مل گئی اس نے تین ریال فی سوار کوئی بیس سواریاں بٹھا کر ہم کو گھنٹہ بھر میں حرم کے سامنے اتار دیا۔ عائشہ چابی لے کر گھر چلی گئی اور باقی سب لوگ یعنی دو عورتیں اور تین مرد طواف کے لیے چلے گئے۔

منیٰ سے مکہ آتے ہوئے سٹیشن ویگن میں ہمارے ساتھ دس سواریاں جن میں دو مرد اور آٹھ عورتیں تھیں راستے میں ان سے گفتگو شروع ہوئی کیونکہ وہ ہمارے خطے کے لوگ دکھائی دیتے تھے یہ سب حیدر آباد دکن کے تھے ان میں ایک نوجوان جس کی عمر

سترہ برس تھی وہ تھا وہ وہاں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا ہے اور حیدرآباد کے ایک مشہور پرانے شاعر واجد علی کا صاحبزادہ تھا۔ یہ سب لوگ پاکستان کے لیے پریشان تھے اور دعاگو تھے۔ ان کی باتوں نے میں یہ سوچنے لگ گیا کہ جس ملک کے لیے ان کے باہر کم از کم سات کروڑ دعاگو ہوں تو اس سے بڑا کیا ASSET ہو سکتا ہے لیکن اس صورت حال کا اگر حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو بہت ہی اہم مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اب حکومت ہند اگر پاکستان سے برسرپیکار ہوتی ہے تو ان حالات میں کیا حکومت ہند ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ جیسے پاکستان کے لیے ہندوؤں پر بھروسہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان حالات میں دونوں ملکوں کے لیے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے کا مطلب ان گنت مسائل جو کبھی بھی حل نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ دونوں ہی بلکہ تینوں ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ بہتر تعلقات نہیں ہوتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ زود یا بدیر تینوں ملکوں کو مشترکہ صنعتی اور دوسرے شعبوں میں مشترکہ منصوبوں پر کام کرنا ہوگا

طواف میں کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا اس لیے کہ بے حد ہجوم تھا کھوے سے کھوا چھل رہا تھا دھکم پیل سے برا حال تھا اور سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ فرش پر کنکر پڑے ہوئے تھے بلکہ روڑے تھے اور ننگے پاؤں چلنا محال ہو رہا تھا یہی حال صفا اور مروہ میں تھا اس کے بعد میں گھر پہنچا کیونکہ ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ اب پھر جوتی بدل گئی۔ چنانچہ میں کسی اور کی جوتی اٹھا لایا۔ گھر پہنچ کر نہایا دانت صاف کیے اور کپڑے بدلے۔ پھر شبو کی اور ہوش آئی اس کے بعد چائے پی کھانا کھایا۔ کئی دنوں کے بعد اطمینان سے کھایا ساتھ والے ہمسائے کافی دیر تک کھانے پکانے میں لگے رہے اس لیے ہم کوئی عشاء کے بعد وہاں سے چلے۔ منی بس والے نے ڈیڑھ ریال طے کرنے کے باوجود دو دو ریال طلب کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال ڈیڑھ ریال فی کس ادا کیے۔ جب وقت منیٰ پہنچے تو بہت سخت سردی تھی لیکن بہر حال رات کٹ گئی۔ رات میں ایک دو بار پیشاب کے لیے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گلے اور ناک میں بہت زیادہ تکلیف رہی اور میں نے ایک دو بار دوائی ڈالی تو اس سے سانس لینے میں آسانی ہوئی۔

مکے میں عائشہ نے سالن بنایا تو میں بازار سے تندوری نان لے آیا۔ کھانے کے بعد عائشہ نماز کے لیے اصرار کرنے لگی اس اصرار پر میں نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے یہ خواہ مخواہ اصرار میرے لیے بلاوجہ مزاحمت کو جنم دیتا ہے۔ عائشہ ناراض ہوگئی۔ دراصل اس کو مغالطہ یہ ہوگیا ہے کہ میں اب تک چونکہ تمام فرائض ادا کر رہا ہوں اس لیے میں اب مستقلاً — PRACTISING مسلمان بن گیا ہوں۔ حالانکہ اس تمام گہما گہمی اور فرائض کی ادائیگی خشوع وخضوع اور گریہ زاری کے باوجود میری غلبیت پسندی سرنگوں نہیں ہوئی اور میں بعض دفعہ اس وقت جب طوافوں اور گریہ زاری کی فضا عروج پر ہوتی ہے تو سوچنے لگ جاتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے کیوں ہے اور یہ لوگ کس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ حج کی تکلیفوں اور صعوبتوں نے عائشہ کے ایمان کو بھی بہت حد تک اندر سے ہلا دیا ہے اور وہ حج کے بارے میں کوئی ENTHUSIATIC نہیں رہی بس ایک دفعہ حج کر لیا ہے ٹھیک ہے۔

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم
کتنے ہیں مجبور دیکھ او نانِ بیداد ہم

۱۶ر جنوری

آج ۱۶ر جنوری ہے اور منگل کا دن ہے اس وقت فجر کی اذان ہوئی ہے، پورے خیموں میں زندگی جاگ اٹھی ہے لیکن یہ رات کہرام کی رات تھی۔ اتنی سردی کہ کسی سے برداشت نہیں ہوسکی اور ہمارے پاس تو کل کائنات ایک کمبل تھا اور ایک دری۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ میرے جسم میں کل شام کو ہی کپکپی شروع ہوگئی اور بخار کی حرارت محسوس ہونے لگی پوری رات میں کھانستا رہا اور کراہتا رہا عائشہ بھی سردی سے گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ ساتھ والی خاتون سردی سے تنگ آکر اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر تنگ آکر خاوند کے ساتھ چمٹ کر لیٹ گئی۔

پندرہ جنوری کا دن اتنی مصروفیتوں اور حرکت میں گزرا کہ اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ روزنامچے کی چند سطریں لکھ لیتا۔ صبح اٹھے تو سب سے پہلے ناشتے کے لیے عائشہ کو لے کر ہوٹل گئے۔ وہاں چائے اور بن کھایا اس کے بعد عائشہ کو گھر چھوڑا۔ وہاں سے پاکستان ہاؤس پہنچے پاکستان ہاؤس میں پورا ڈیلیگیشن۔ کوثر نیازی اور افسران میٹنگ کر رہے تھے۔ میں زبردستی اندر چلا گیا اور وہاں میں نے واپسی کی تاریخوں میں تبدیلی کے لیے درخواست لکھی اس پر کاہلوں نے سفارش کی۔ کوثر نیازی نے دستخط کیے اور ڈائریکٹر حج کو دے دی۔ اس نے کہا کہ پانچ بجے تک بتا دوں گا۔

کوثر نیازی نے کہا کہ دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں اس لیے کہ ڈیلیگیشن اور پریس پارٹی کی دعوت ہے چنانچہ ہم وہاں سے نکل کر فندق ڈھونڈتے ہوتے وہاں پہنچے۔ فندق عربی میں ہوٹل کو کہتے ہیں۔ اقبال میر اور اسکی بیگم اور وقار وغیرہ وہاں ٹھہرے ہوتے تھے۔ وہاں اقبال، وقار وغیرہ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گپ کی۔ چائے کے دور چلے اور حج کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال ہوا وہاں سے اٹھ کر ہم پھر پاکستان ہاؤس آئے۔ میں وہاں گپ کرتا رہا۔ مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثریت کی رائے یہی تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں حاجی بھیج کر خواہ مخواہ مسائل پیدا کیے گئے ہیں اور لوگوں کو اس INSTITUTION سے بیزار کیا گیا ہے۔ ظہر کی نماز بھی وہیں پاکستان ہاؤس میں پڑھی اور پھر دوپہر کے کھانے کے موقع پر سعودی عرب کے وزیر اوقاف اور دوسرے عمائدین بھی موجود تھے ڈیلیگیشن کی طرف سے پاکستان کے سفیر نے تقریر کی۔ پھر غلام غوث ہزاروی نے لکھی ہوئی تقریر پڑھی اس کے بعد مفتی ازہر نے چند جملے کہے اور آخر میں کوثر نیازی نے تحریر کی ہوئی تقریر پڑھی لیکن لاؤڈ سپیکر کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف تقریریں ٹیپ کی جا رہی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں موجود مہمانوں کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس کے بعد کھانا ہوا۔ کھانے کے بعد ٹیلی ویژن والوں نے فلمیں لیں اس موقع پر کوثر نیازی نے مجھے بھی بلا لیا۔ یہاں پر بہت سے لوگوں سے تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ کیبنٹ سیکرٹری مسٹر صوفی بھی آئے ہوتے تھے۔ ہر ایک جو اپنے خرچ پر آیا تھا وہ لہزا اُبہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے خرچ پر آیا ہے چنانچہ صوفی صاحب نے بھی کہا کہ گو مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ وہ سرکاری خرچ پر چلے جائیں لیکن مسٹر صوفی نے کہا کہ انھوں نے معذرت کر دی کیونکہ

حج وہ ہوتا ہے جو اپنے خرچ سے کیا جائے۔صُوفی نے مجھ سے کہا کہ آپ کیسے آتے ہیں کوثر نیازی مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ اپنے خرچ پر آئے ہیں یا ان کو ان کی بیگم لائی ہیں۔اس موقع پر پاکستان کے صحافیوں کے وفد سے بھی ملاقات ہوئی اور نوک جھونک ہوتی رہی دراصل میرا حج پر آنا ایک عالم کو پسند نہیں ہوا خصوصاً اسلام پسند یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاتھ سے مجھ پر حملہ آور ہونے کا ایک ہتھیار چھن گیا ہے وہ دہریت وغیرہ کا جو الزام عائد کرکے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو ہمارے خلاف اکساتے تھے ان کے لیے یہ کام مشکل ہوگیا ہے اس وفد میں سب ہی دوست تھے اس لیے پاکستان کے تھوڑے سے حالات کا پتہ چلا۔

یہاں سے واپس ہونے لگا تو کوثر نیازی نے خود کہا کہ وہ پاکستان واپسی کی تاریخ پہلے کروا دینگے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔اس کے بعد یہاں سے نکل کر میں جمرات پر کنکریاں مارنے کے لیے نکلا راستے میں مرزا طاہر بیگ مل گئے انھوں نے بہت ڈرایا کہ بہت ہجوم ہے اور پریشانی ہے۔ بی بی کو نہ لے جاؤ لیکن ہم نے اللہ کا نام لے کر جانے کا فیصلہ کیا۔عائشہ نے اپنا پرس طاہر بیگ کو دے دیا۔خیر ہم ہجوم کو چیرتے، دھکم پیل میں حصہ لیتے ہوئے جمرات تک پہنچ ہی گئے اور فرض پورا کر ہی لیا مجھے وحشت ہو رہی تھی کہ اگر عائشہ نے یہ ہنگامہ نہ دیکھا تو اس کے دل میں حسرت رہ جائے گی اور وہ واپس جا کر لاف زنی نہیں کرسکے گی اور بلاوجہ وہ اپنی ہیٹی محسوس کرے گی۔چنانچہ کل عائشہ نے بھی ہمت کی اور یہ کام مکمل کرلیا۔اب کم از کم سب سے اہم ہنگامہ کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔واپسی پر ہم نے کوکا کولا پیا۔پھر ایک نان خریدا اور چائے پی اس طرح شام کی روٹی ہوگئی۔ہم شام کے قریب واپس پہنچے۔اب پانچ بجے پاکستان ہاؤس پھر جانا تھا لیکن میں نے اپنے ہمسایوں کو پوری روئیداد دیتا دی اور کہا کہ میرے جانے کی ضرورت نہیں وہ جا کر پاسپورٹ لے آئیں۔چنانچہ وہ چلے گئے اور اس دوران مجھے بخار کی حرارت شروع ہوگئی اور سردی نے جان نکال دی لیکن یہاں سردی کا آخر علاج ہی کیا تھا۔اسپرو کھائی اور سر منہ لپیٹ لیا لیکن رات سخت تکلیف میں گزاری، ہر ایک کو سردی نے پریشان کر رکھا اور بقول عائشہ حج کا اب پتہ چلا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چار پانچ دن جو یہاں کاٹے ہیں اتنی تکلیفوں، پریشانیوں

اور صعوبتوں سے بھرپور دن اس سے پہلے شاذ ہی گزارے ہیں آج ایک لحاظ سے خوشی ہے کہ یہ اب آخری دن ہے۔ ویسے آج کا بھی پورا دن ہنگاموں کا دن ہے سب سے پہلے پاکستان ہاؤس جا کر AIR PASSAGE کا پتہ کرنا ہے، اس کے بعد کنکر مارنے ہیں۔ ارادہ ہے ظہر کی نماز سے پہلے ہی یہاں سے نکل چلیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

اس وقت بس میں بیٹھا ہوں اور عازم مکّہ ہونے والے ہیں۔ ایک حاجی حضرت سے ابھی ہاتھاپائی سے فارغ ہوا ہوں۔ اس لیے کہ وہ عائشہ کو دھکا دے کر اپنی عورتوں کو اس نشست پر بٹھانا چاہتا تھا۔ بہرحال یہ حاجیوں کا معمول ہے کہ وہ نشستوں کے لیے دھکم پیل کریں۔

آج جمرات پر کنکر زنی کا آخری دن تھا۔ آج جو ہجوم تھا الحفیظ والامان والا معاملہ تھا اور مجھے ہر جمرہ پر چودہ چودہ کنکر مارنے تھے، سات اپنے اور سات عائشہ کے۔ آج ایک گونہ اطمینان تھا کہ یہ جمرات پر کنکر زنی کا آخری دن ہے اور آج دھکم پیل سے نجات مل جائے گی

لیکن میں جب کنکر زنی کے لیے اپنے آپ کو ہجوم کے سپرد کر رہا تھا اور یہ ہجوم کا ریلا مجھے آگے جمرات کی طرف بڑھائے لیے جا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ کس طرح ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی بعض روایتوں کو انسان نبھانے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کو تقدس بخش دیتا ہے اور روایت کی پاسداری صرف مذہب کے تحت ہی نہیں ہوتی ویسے بھی انسان ماضی کی روایتوں کو سینے سے لگائے رکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اب انہی جمرات کو لے لیا جائے یہاں تین جمرے ہیں۔ جمرۂ عقبیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ اولیٰ۔ یہاں تینوں جمروں کو تین دن سات سات کنکریاں مارتے ہیں اس کنکر زنی کی پشت پر جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ یوں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لختِ جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے جا رہے تھے تو شیطان نے آپ کو انہی تین جگہوں پر بہکانا چاہا لیکن حضرت ابراہیم نے شیطان کو دھتکار دیا اور اس کو بھگانے کے لیے کنکریاں ماریں۔ اور آج ہر سال ہم شیطان کو بھگانے کے لیے کنکر اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ آج شیطانی قوتیں کون سی ہیں۔ بہرحال خدا خدا کر کے میں اس فریضے سے فارغ ہوا اور ظہر کے بعد وہاں سے خیمے میں پہنچے اور سامان

سر پر رکھ کر معلم کے اڈے پر آئے تو معلم کہنے لگا کہ میرے تین ملازم وہاں پر تھے آپ نے سامان خود کیوں اٹھایا ہوا ہے۔ اب وہ قطعی جھوٹ بول رہا تھا۔

لیکن جھوٹ اور فریب یہاں کی زندگی کا قطعی معمول ہے۔ یہ پانچ دن جو تکلیف کے گزارے ہیں۔ ان کے متعلق سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پورے پانچ دن ہو گئے ہیں کہ مجھے اجابت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ پاخانے جہاں بنائے گئے تھے وہاں پیشاب کے لیے کھڑا ہونا محال تھا چہ جائیکہ اجابت کے لیے وہاں پر رکا جاتے اس ڈر سے اجابت ہی نہیں ہوئی۔ اب مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ اتنی تاخیر کہیں بیمار نہ کر دے۔ اچھا باقی پہنچنے پر۔ اس وقت سعودی عرب کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔

۱۷/ جنوری

یہ بدھ کا دن ہے اور صبح کا وقت ہے سعودی عرب کے وقت کے مطابق ڈیڑھ بجا ہے یعنی فجر کی نماز باجماعت کو ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ ہمارے ہاں فجر کے ساڑھے چھ سات کا عمل ہو گا۔ میں کل سے عصر کی نماز کا بستر میں لیٹا ہوں اور اس وقت تک بستر میں ہی ہوں۔ ہم منیٰ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں پہنچ گئے تھے بس پہنچنے کی دیر تھی کہ مجھے بخار ہو گیا اور گلا بالکل بند یعنی میں بالکل بول نہیں سکتا گلے کا تو ابھی تک وہی حال ہے۔ لیکن بخار آرام کرنے سے اتر گیا ہے۔ رات اسپر دلی۔ کف سیرپ لیا، غرارے کیے۔ ہاں کل آتے ہی اجابت کے لیے اگرول لی اور صبح کو سالٹ پیا ہے لیکن ابھی تک اجابت نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ سے بھی طبیعت بہت خراب ہے اور فکر لاحق ہو رہا ہے۔ ویسے پیٹ قطعاً بوجھل نہیں ہے حالانکہ رات کو

اچھی غذا لی۔ یعنی گھر کے پکے ہوئے پراٹھے، مرغی اور دال خاصا پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ خیال تھا کہ اس سے کچھ دباؤ پڑے گا اور مرغن غذا پیٹ کو صاف کرنے میں مدد دے گی لیکن تا حال صورت کوئی بہتر نہیں ہوئی ویسے اب طبیعت بحال ہے بازار سے سودا سلف بھی لانا ہے۔

۱۸ر جنوری

جمعرات کا دن ہے فجر کی نماز ہو چکی ہے اور میں ابھی بستر ہی پر بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں پرسوں عصر کے وقت سے ہی بستر پر ہوں۔ طبیعت ابھی تک بحال نہیں ہوئی بخار کی حرارت ہے گلا تو بالکل بند ہو گیا تھا اور قبض نے سخت پریشان رکھا۔ اجابت نہ ہونے کی وجہ سے بخارات سر کو چڑھنے لگے تھے اور غنودگی طاری ہونے لگی کل بہت تھوڑی سی اور آج صبح پھر بہت معمولی سی اجابت ہوئی ہے کھل کے پاخانہ آجائے تو طبیعت قدرے بہتر ہو جائے۔ غرارے بھی کر رہا ہوں۔ گلا پہلے سے بہتر ہے تمام دن بستر پر پڑے پڑے تنگ آگیا ہوں اُوپر لاہور سے کوئی خط نہیں آیا اس نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ اگر لاہور سے خط ہی آجاتے تو لاہور کا پتہ چلے اور اطمینان ہو جائے۔

دیارِ غیر میں بیماری ضرورت سے زیادہ بے بس بنا دیتی ہے اور ویسے تو اس دیار کو دیارِ حبیب کہا جاتا ہے لیکن جب طبیعت خراب ہو بدن ٹوٹ رہا ہو۔ حرارت ہو تو ہر دیار، دیارِ غیر ہی معلوم ہوتا ہے اس وقت دوپہر ہے اور میں ابھی تک غنودگی کی حالت میں ہوں اجابت تو ایک دو دفعہ ہوتی ہے لیکن نہ جانے اتنی کمزوری کیوں ہے۔ کمر میں شدید درد ہے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا بس طبیعت یہی چاہتی ہے کہ لیٹا رہوں دو سطریں لکھیں لکھتا ہوں تو بازو تک درد کرنے لگتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔

عصر کے قریب عائشہ نہائی اس لیے وہ منیٰ میں ہی حیض کی مصیبت میں پھنس گئی، اب حج کے

فرائض حیض کے دوران میں بھی پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں اس لیے وہاں کے سب فرائض اس نے مکمل کر لیے تھے لیکن آخری فرض طواف کا تھا وہ حیض کے خاتمے پر ہی ادا ہو سکتا ہے چنانچہ اس خیال سے کہ حیض بند ہو گیا ہے وہ نہائی، کپڑے بدلے اور طواف کے لیے تیار ہوتی۔ لیکن جیسے وہ گھر سے باہر نکلنے لگی پھر اس کی شلوار خون سے دھبے دار تھی اس سے اس کی طبیعت خاصی خراب ہوئی اور اداس ہو گئی۔

میں بھی نہا کر تیار ہو گیا اور ہم ویسے ہی باہر گھومنے اور Window Shopping کرنے چلے گئے ہم سب سے پہلے آپا سعیدہ کو دیکھنے کے لیے معلم سید مکی مرزوقی کے ہاں محلہ شامیہ گئے وہاں مکی مرزوقی سے اس کے پاکستان میں ایجنٹ محمد افضل کا پتہ کیا اس کو بڑی مشکل سے ڈھونڈا یہ محمد افضل، خالو جی محمد طفیل کے چھوٹے بھائی محمد اکبر کا لڑکا ہے وہ مکی مرزوقی کا ایجنٹ ہے اور اپنی بیوی کو لے کر حج کے لیے آیا ہوا ہے چنانچہ وہ چھپ کر ایک کمرے میں دبکا ہوا تھا اس لیے کہ حاجی اس کو پریشان کرتے ہیں۔ بہر حال اس کو ڈھونڈھ نکالا اور بیٹھے وہاں سے سعیدہ اور عبدالرحیم کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حرم سے دو تین میل کے فاصلہ پر کسی کے ہاں ٹھہرے ہوتے ہیں۔ یہاں سے نکلے تو پھر ہم WINDOW SHOPPING کرتے ہوتے حرم کے دوسرے دروازے پر پہنچے تو آگے سے م۔ش مل گیا۔ اس سے میں پہلے بھی مل چکا ہوں۔ لیکن عائشہ یہاں پہلی بار ملی تھی بہت خوش ہوئی ہم نے اکھٹے چائے پی۔ اس کے بعد رسول اللہ کی جائے پیدائش دیکھنے گئے وہاں اب لائبریری ہے حضرت علیؓ کی رہائش گاہ بھی دیکھی ان میں سے کسی عمارت یا مکان کو PRESERVE کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس کے پیچھے موجودہ حکمران خاندان کا فلسفہ کار فرما ہے کہ اگر ان عمارتوں کو محفوظ کیا جائے تو لوگ یہاں عبادت شروع کر دینگے اور یہ شرک ہو گا۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ جو لوگ علی ہجویری کی پرستش سے باز نہیں آتے وہ رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں کی پرستش اور عبادت سے کیسے باز رکھے جا سکتے تھے۔ لیکن ان باتوں اور میری وہابیت کے باوجود تاریخی اور تہذیبی طور پر مجھے یہ صورت حال گوارا نہ ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ شاہ فیصل اور سعودی حکومت ہی نہیں بلکہ عرب بادشاہ ہوں یا ترک انھوں نے آخر

ان تاریخی عمارتوں سے اس قدر اغماض کیوں برتا اور ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو خوب صورت اور دلفریب عمارتوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی مکے کے چپے چپے پر تاریخی عمارتیں اور مکانات ہیں جن سے سینکڑوں برس پرانی روایات وابستہ ہیں آخر ان روایات کے حوالے سے کیوں ان عمارتوں کو جاذب نظر نہیں بنایا گیا اس سوال کا جواب میرے پاس کوئی نہیں۔

م ش (محمد شفیع) سے دلچسپ باتیں ہوتی رہیں وہ یہی کہتا رہا کہ اس وقت سب سے بڑے تین شیاطین ہیں۔ امپریلزم، زایونزم اور کمیونزم۔ اب میں نے میاں شفیع سے خاصی بحث کی کہ امپریلزم، زایونزم (صیہونیت) اور کمیونزم میں ایک بنیادی فرق ہے اور تینوں کو ایک ساتھ گردن زدنی ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر امپریلزم کے ہاتھ میں کھیلا جائے کیونکہ آج امپریلزم اور زایونزم کو صحیح معنوں میں کوئی طاقت للکار رہی ہے تو وہ کمیونسٹ پارٹیاں ہی ہیں اور سوشلسٹ ممالک ہیں جو ان طاقتوں کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں لیکن میاں شفیع اپنے موقف پر ڈٹے رہے ان کی پشت پر سالہا سال کا سامراجی پروپیگنڈہ ہے جو ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوتے ہے اور وہ دراصل کمیونزم کو بنیادی طور پر ایک مذہب دشمن اور خدا دشمن تحریک سمجھتے ہیں اور ان کو اور ان کے ہم مسلک لوگوں کو لاکھ سمجھایا جائے کہ کمیونسٹ تحریک بنیادی طور پر سماجی تبدیلیوں کی تحریک ہے لیکن بعض دفعہ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر یہ بات تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور عام مسلمانوں کے جذبات کو سامراجیوں کی طرح مشتعل رکھنا چاہتے ہیں جبکہ سامراجی عیسائیوں اور مسلمانوں کو اور ہر مذہب کے ماننے والوں کو اس حوالے سے مشتعل کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی میاں شفیع سے خاصی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ میں ان سے بھی پوچھتا رہا اور ویسے بھی یہ سوال مجھے پریشان کرتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ **تمام پیغمبر سامی کیوں ہیں**

غیر سامیوں کے پیغمبروں کا نہ تو قرآن میں ذکر ہے نہ توریت

میں نہ انجیل میں۔

م ش نے اس ضمن میں کہا کہ قرآن میں ناموں کا ذکر تو نہیں ہے لیکن اس امر کا ذکر ہے کہ

ہم نے تمام قوموں کو ہادی اور پیغمبروں سے نوازا۔ لیکن پھر بھی یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ کیا کوئی بھی غیر سامی پیغمبر اور اس کی امت اس قابل نہ تھی کہ توریت اور انجیل میں نہ سہی قرآن میں جو آخری الہامی کتاب ہے ان کا نام اور عقائد و اعمال کا چند الفاظ ہی میں تذکرہ آجاتا اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ سوال ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تمام انبیاء جن کا الہامی کتابوں میں ذکر ہے وہ غلامی کے ہی تقریباً ہزار سالہ دور میں مبعوث ہوتے حالانکہ اس کے بعد نوع انسانی کے مسائل پہلے سے کہیں زیادہ گنجلک، پیچیدہ اور کٹھن ہو گئے ہیں لیکن انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو گیا؛ غالباً ادر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مرزا غلام احمد نے کرشن اور گورو نانک تک کو پیغمبر تسلیم کیا ہے یعنی اگر ہم اس امر کو دل سے تسلیم کرتے ہیں تو اس برصغیر کی نفسیاتی کیفیت مختلف ہوتی اور یہ جو مسلمانوں میں اپنے کو ایک برتر نسل اور بہتر مذہب جاننے کا جذبہ سرایت کیے ہوتے ہے یہ نہ ہوتا۔ اور نئے حالات میں ہندوؤں کے ساتھ ADJUST کرنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اور شاید کسی حد تک ہندو بھی مسلمانوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ان میں جو مسلمان اور اسلام دشمنی کا جذبہ تاریخی طور پر پایا جا رہا ہے وہ قدرے کم ہو جاتا۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بنیادی طور پر بین الاقوامی کیریکٹر رکھنے کے ساتھ ساتھ مخصوص عرب روایات کا حامل مذہب ہے اس لیے عربوں کے لیے یہ عبادات ایک معنی رکھتی ہیں۔ ایک تہذیبی ورثہ ہیں۔ ایک تسلسل کا مظہر ہیں۔ کیونکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ ایک اسمٰعیل اور ایک اسحٰق۔ اسمٰعیل عربوں کے جد امجد ٹھہرے اور اسحٰق بنی اسرائیل کے۔ لیکن مذہب عبادت، پرستش یہ جذبے انسان پر اس قدر حاوی ہیں کہ تمام سوچیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اور جب بیت اللہ، حرم یا مسجد نبویؐ میں انسان پہنچتا ہے تو چاروں طرف کی گریہ زاری سجدے اور گڑگڑاہٹ اس پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ عرفات کے میدان میں جہاں سات لاکھ کے قریب نفوس گریہ زاری کر رہے ہوں وہاں کی کیفیت کا اندازہ لگانا محال ہے۔ بہر حال اب جب سے واپس آیا ہوں اور یہ فرائض مکمل کر چکا ہوں تو کیفیت دوسری ہے اب عقل پسندی کا رجحان زیادہ ہے لیکن یہ سوچتا ہوں کہ کیا پرستش کا جذبہ بھی انسان میں کہیں ایک بنیادی جذبہ

تو نہیں ہے اور انسانی ترقی کے تمام مدارج میں کسی نہ کسی صورت میں اس جذبے کو خاصا عمل دخل تو نہیں رہا ہے بہر حال اب اگر اللہ تعالیٰ نے ہمت دی تو اسلام کا از سر نو مطالعہ کروں گا اور اس کی مارکسی توجیہہ بھی انشاءاللہ کروں گا۔

رات کو آتی دفعہ میں اور عائشہ آلو لے آئے اور نان بھی خرید لائے آلوؤں کی بھوجی پکا کر کھانا کھایا اور سو رہے۔

۱۹ر جنوری

آج جمعہ کا دن ہے فجر کی اذان پر میں اٹھ بیٹھا۔ پانی گرم کیا اور غرارے گئے اس لیے کہ رات کو گلے میں خاصا درد رہا۔ اس کے بعد چائے بنائی۔ چائے پی کر عائشہ پھر نہائی اور تیار ہو کر حرم میں طواف کے لیے آگئے امید ہے کہ آج عائشہ کے حج کا فریضہ مکمل ہو جائے گا۔ میں یہیں حرم میں بیٹھا اس کا منتظر ہوں۔ حرم میں اب بھی بہت کافی ہجوم ہے مشتاقانِ طواف کی اب بھی تعداد کا وہی عالم ہے جو پہلے تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ عائشہ کے طواف مکمل ہو گئے ہیں اس نے نفل بھی پڑھ لیے اب وہ صفا اور مروہ کے سات چکر لگانے کے لیے گئی ہے اللہ کرے یہ آخری چکر اس کے پورے ہو جائیں اور وہ بی بی حاجن بن جائے تو اس کو اور مجھے سکون ہو اس لیے کہ یہ تمام صعوبتیں تو اسی کے لیے اٹھائی ہیں۔

حج تو اذیت کوشی کا دوسرا نام ہے آج جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے مجھے جو اذیت اٹھانی پڑی ہے اس سے تو میں چیخ اٹھا ہوں اور اس وقت جمعہ کی نماز ادا کئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اس اذیت کی تلخی ہنوز میرے جسم، میرے چہرے اور میرے موڈ سے عیاں ہے اس وقت میرا بس چلے تو میں کسی کا گریبان پھاڑ دوں یا اپنی سینہ کوبی کروں تاکہ اذیتوں کا یہ بوجھ قدرے ہلکا ہو سکے بعض دفعہ تو سوچتا ہوں کہ یا اللہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور اوپر سے

عائشہ کی دلجوئی جو بعض دفعہ دل آزاری پر منتج ہوتی ہے اور پھر موڈ دوسری طرح خراب ہو جاتا ہے
آج نماز جمعہ کے لیے میں اذان سے بھی ایک گھنٹہ پہلے مسجد میں داخل ہوا لیکن عالم یہ ہے کہ نچلی منزل بھی پر اور اوپر کی منزل پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بہتیری کوشش کی کہ کوئی جگہ مل جائے لیکن بالکل ناکام رہا۔ چنانچہ ۴۵ منٹ تک مجھے کھڑا رہنا پڑا۔ جب اذان ہوئی تو لوگ سنتوں کے لیے کھڑے ہوئے کہیں جا کر صف میں کھڑے ہونے کو جگہ ملی اس کے بعد خدا خدا کر کے نماز ادا کی۔ اس کے بعد عائشہ کو ڈھونڈنا شروع کیا اس کے بعد خدا خدا کر کے وہ ملی۔ مسجد سے باہر نکلنا ایک کارے دارد تھا چنانچہ دھکم پیل اور مسلسل آدھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مسجد سے باہر نکلے اور گھر تک پہنچنے کے لیے ہجوم کو مزید آدھ گھنٹہ برداشت کرنا پڑا۔ حالانکہ ہمارا کمرہ حرم سے بصد مشکل پچاس گز کے فاصلے پر ہے اوپر سے عائشہ نے اصرار کیا کہ جا کے نان لاؤ اب تندوری نان لانا تھا جو جوئے شیر لانے سے کم نہیں چنانچہ نان لینے کے لیے گیا۔ بالکل پائنچے اوپر کر کے جس طرح اکھاڑے میں اترا جاتا ہے خدا خدا کر کے نان لیا اور گھر آیا۔ اب سالن بالکل بے مزہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس میں مرچ زیادہ تھی گھر میں میٹھا کچھ نہیں تھا۔ اس سے بھی موڈ خراب ہو گیا۔ چائے بنائی عائشہ سے کہا کہ پی لو اس نے انکار کیا اس تکرار، اصرار اور منانے میں عینک ٹوٹ گئی۔ چنانچہ اس گرمی سردی میں عینک بنوانے کے لیے گیا بصد مشکل عینک ساز کی دکان ڈھونڈی لیکن وہ جمعہ کی وجہ سے بند تھی اب شام کو عینک ٹھیک کراؤں گا اس وقت یہ سطور عینک کے بغیر ہی لکھ رہا ہوں عائشہ سوتی ہے۔ مجھے گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی۔ جیسے پسینہ سوکھے گا اور بدن ٹھنڈا ہو گا تو شاید آنکھ لگ جائے اس کے بعد موڈ بھی تھوڑا سا ٹھیک ہو گا۔ یہ بھی سفر کا ایک پہلو ہے۔

عینک ٹھیک کروانے گیا۔ دکاندار کہنے لگا کہ نیا فریم لگے گا۔ میں نے نئے فریم کی قیمت پوچھی جواب ملا بیس ریال اب ممکن ہے بیس ریال درست قیمت ہی ہو۔ لیکن میرے لیے تو یہ قیمت ناقابل برداشت ہے چنانچہ واپس آ گیا ہوں اور ٹوٹی ہوئی کمانی سے ہی گزارہ کرنے کا ارادہ ہے اور خدا نے چاہا تو پاکستان جا کے اس کو درست کراؤں گا یا فریم بدلواؤں گا۔

عائشہ کا موڈ آج بہت ہی خراب ہے اس لیے کہ صبح وہ طواف کر آئی اس وقت اس کا حیض

بند تھا اور یہی خیال تھا کہ اب بند ہو گیا ہے۔ لیکن واپسی پر اب پھر خون آ رہا ہے اس نے اس کا موڈ خراب کیا ہے کہ وہ بات بات پر لڑ رہی ہے میں خدا سے دعا مانگ رہا ہوں کہ اللہ اس کا موڈ بہتر کر دے اور اس کو صبر عطا ہو۔ میں نے اس کو بہتر اسمجھایا ہے لیکن موڈ کی خرابی و پریشانی آسانی سے تو ٹھیک نہیں ہوتی۔

میں عینک والے کے ہاں سے واپس آ رہا تھا کہ مولوی سعید ضیاءالاسلام، مجاہد الحسینی اور شورش جنگ والا مل گئے وہ آج طواف کے لیے آتے ہوتے ہیں ان سے کوئی نصف گھنٹہ تک گپ ہوتی رہی ویسے آج کا دن بھاری ہے دوپہر کے بعد سے طبیعت عائشہ کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی ہے اللہ تعالیٰ رحم کرے پھر عائشہ سے جھگڑا ہو گیا ہے نہ جانے کیا بات ہے۔ میری طبیعت بے حد پریشان ہے اور رونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جگہ ایسی ہے جہاں وقت گزارنے کے لیے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے دن رات ایک ساتھ رہنا ہوتا ہے اور تمام صبر اور برداشت کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکرانا قدرتی امر ہے اس میں کس کی زیادتی ہے اور کس کی نہیں ہے زیر بحث نہیں آسکتی بلکہ جذبات اور موڈ کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ہر حالت میں ہوتا رہتا ہے اور اس کا نتیجہ ایک دوسرے سے ناراضگی کی صورت میں نکلتا ہے ابھی گھر پہنچنے میں بیس دن باقی ہیں دست بدعا ہوں کہ یہ دن خیر خیریت سے گزر جائیں ورنہ سفر کی صعوبت کئی گنا بڑھ جائے گی۔

تر دیکھ کے میری آنکھوں کو یہ بات، سنا تا ہے اکثر
ہیں کتنے جس کو چاہ میاں وہ مشکل ہے آسان نہیں

۲۰؍ جنوری

ہفتہ کا دن ہے۔ اس وقت عصر کی نماز ہو چکی ہے۔ تمام دن گھر پر ہی رہا۔ صبح کو تھوڑی دیر کے لیے ڈائریکٹر احسن کو دیکھنے کے لیے سفارت خانے گیا لیکن ہاں پر نوٹس لگا ہوا تھا کہ جہازوں میں تبدیلی کا علم ۲۵؍ جنوری کو ہو گا یہ دیکھ کر میں واپس آ گیا۔ پھر پھل وغیرہ خریدا۔ عائشہ کی طبیعت

خراب تھی۔ وہ دن بھر لیٹی رہی۔ دوپہر کو اس نے دال اور پراٹھے پکاتے یہ کھا کر خوب سویا۔ آج مدینے بھی غلام حیدر ربواب کے نام ایک خط لکھا اور پھر شام کے قریب مختار اور کوثر کے نام خط لکھا اور اس کو پوسٹ کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ پوسٹ کر کے نکل رہے تھے کہ پی پی آئی والے معظم سے ملاقات ہو گئی اس کے ساتھ آدھ گھنٹہ تک گپ ہوتی رہی

وہ عبدالشکور کے ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۳ میں ٹھہرا ہوا ہے اس کے بعد WINDOWSHOPPING کرتے رہے راستے میں ایک دو تھڑوں پر سستانے اور دنیا کا تماشہ دیکھنے کے لیے بیٹھ گئے اس وقت ہم صفا اور مروہ کے دالان میں بیٹھے چکر کاٹنے والوں کا تماشہ کر رہے ہیں۔

کچھ امتیاز شیخ و برہمن نہیں یہاں
جی کیوں نہ خوش ہو خشت خمار دیکھ کر

۱۲/ جنوری

اتوار کا دن ہے، فجر کی نماز باجماعت پڑھ کے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ حرم میں بیٹھا ہوں اور ایک نماز جنازہ کے لیے اعلان ہوا ہے۔ اب نماز جنازہ کے لیے کھڑا ہو رہا ہوں اس کے بعد پھر لکھوں گا نماز جنازہ بس ایک دو منٹ کا معاملہ ہے۔ یہاں کا رواج یہ ہے کہ میّت حرم میں لے آتے ہیں اور امام ہر نماز کے بعد جنازہ پڑھا دیتا ہے اور اس کے بعد وارث اس کو لے جا کر دفنا دیتے ہیں نماز جنازہ ایک ہی ہوتی ہے میتیں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں۔

آج بہت دنوں کے بعد فجر کی نماز کے لیے حرم میں آنا ہوا ہے۔ دراصل حج کی تقریبات شروع ہونے سے بھی پہلے ہی ہم نے حرم میں آنا ترک کر دیا تھا۔ اس لیے کہ ہجوم بے پناہ ہونے لگا تھا اور ڈر رہتا تھا کہ اس ہجوم میں عائشہ کہیں پس ہی نہ جاتے۔ چنانچہ آج بھی آتے ہیں تو اوپر کی چھت پر گو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن آج تو آخری صف میں ہیں ہجوم اب بھی ہے لیکن اب کم ہونا شروع

ہو گیا ہے اور لوگ اب واپس جا رہے ہیں یا مدینے کا رخ کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب سے آخر جانے والے پاکستانی ہی ہوں گے۔ یہاں پاکستان کے متعلق کوئی خبر نہیں ملتی پاکستانی اخبارات بھی دیکھنے کو نہیں ملتے پہلے سفارت خانے کے دفتر میں پرانے اخبار پڑے رہتے لیکن اب وہاں بھی نہیں ہوتے یہاں مختلف لوگوں سے کچھ افواہیں اور کچھ سیکنڈلز SCANDALS سننے میں آجاتی ہیں مثال کے طور پر پرسوں میاں محمد شفیع سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ سعودی حکومت نے مفتی محمود کو شاہی مہمان تصور کیا ہے اور ان کو پاکستان ہاؤس سے شاہی مہمان خانہ میں منتقل کر لیا تھا۔ اس بات کی تصدیق میں نہیں کر سکتا لیکن مجھے اتنا محسوس ہو رہا ہے کہ پہلے دن منیٰ میں مفتی محمود وہاں پاکستان ہاؤس میں موجود تھے لیکن دوسرے روز جب میں گیا ہوں تو وہاں موجود نہیں تھے اور تو اور پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے جو استقبالیہ دیا گیا تھا اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے بھی تقریر کی تھی وہاں بھی موجود نہ تھے۔

کل معظم نے بتایا کہ پاکستانی ڈیلی گیشن کو حکومت پاکستان نے فوراً واپس طلب کر لیا ہے۔ چنانچہ کوثر نیازی کو جن کی واپسی ۲۲ جنوری کو تھی وہ ۱۸ ہی کو واپس چلے گئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ایک بات عیاں ہے کہ یہاں جو حاجی آئے ہیں ان میں بھٹو کا نام لیوا کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ نیز باہر سے جو لوگ آئے ہیں وہ پاکستانی سیاست کے متعلق جو تھوڑا بہت جانتے ہیں اس میں وہ ایوب کے معترف نظر آتے ہیں بھٹو کا باہر کی مسلم دنیا میں کوئی زیادہ IMAGE دکھائی نہیں دیتا۔

ہاں کل ایک لطیفہ ہو گیا۔ کل شام کو میں اور عائشہ WINDOW SHOPPING کرتے کرتے تھک کے ایک تھڑے پر بیٹھ گئے کہ تھوڑا سا سستالیں کہ اتنے میں ایک لمبا تڑنگا شخص لمبی داڑھی رکھے، عربی لباس پہنے آیا اور کہنے لگا کہ پردہ کرایا کرو۔ میں نے کہا کہ جاؤ یار اپنا کام کرو کیوں تنگ کرتے ہو، وہ پھر کہنے لگا کہ داڑھی رکھو نبی کا حکم ہے اتنے میں ایک اور پاکستانی بوڑھا گزرا۔ اس نے اسے ڈانٹا کہ تم کون ہوتے ہو پریشان کرنے والے۔ لیکن وہ بولے جا رہا تھا۔ آخر میں اور عائشہ اٹھ کر چلے آئے اور وہ پھر بولتا رہا۔ یہاں لاکھوں انسان آتے ہوتے ہیں کوئی ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن ہمیشہ جو بھی مداخلت کرنے والے ملیں گے وہ پاکستانی اور

ہندوستانی ہوں گے۔ ان کو اسلام کی اجارہ داری کا ایک عجیب و غریب خبط ہے اور اس کا اظہار وقت بے وقت کرتے رہتے ہیں اور اب دوسروں کے ساتھ بھی کریں گے لیکن زبان نہ جاننے کی وجہ سے ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ روزانہ ان عربوں سے بھی لڑائیاں لڑیں۔

باقی ایک بات واضح ہے کہ اسلام کی قرون اولیٰ میں جو سب سے بڑی خوبی بیان کی جاتی تھی کہ اس کی تعلیمات نے ایک نیا انسان پیدا کیا تھا۔ جو ان تعلیمات کا چلتا پھرتا مظہر تھا۔ وہ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مکے کے گلی کوچے، یہاں کے دکاندار، یہاں کے معلم، یہاں کا ہر باشندہ دھوکے فریب، لوٹ اور نفع اندوزی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آتا ہے ان کی نمازیں ان کے حج بالکل ایسے ہی ہیں جیسے انگلستان کے لوگ کلب جاتے ہیں، کرسمس مناتے ہیں۔ یہ نمازیں، روزے اور حج ان کے خون میں رچے ہوئے ہیں۔ ہزارہا برس کی روایت ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہوتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ چونکہ ان کی اپنی زبان میں یہ تمام عبادات ہیں اس لیے ان کو غیریت اور اجنبیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایک گونہ تشفی اور تسکین بھی ہوتی ہے جیسے کوئی ہیر وارث شاہ پڑھ رہا ہو تو اس کو بھی حظ آتا ہے۔ اسی طرح قرآنی شعریت سے بھی وہ حظ اٹھاتے ہیں۔

۲۲ جنوری

پیر کا دن ہے اس وقت ظہر کی نماز کے لیے حرم شریف میں بیٹھا ہوں۔ عائشہ بھی پاس ہے آج معمول ٹوٹ گیا اور نہ تو تہجد کے لیے اٹھے، فجر کی نماز ہوئی تو عائشہ اٹھی اور اس نے نماز پڑھی لیکن میں لیٹا ہی رہا۔ نماز کے بعد عائشہ بھی لیٹ گئی اور پھر دن چڑھے اٹھے چائے بنائی اس کے بعد نان بازار سے لایا اور ناشتہ کیا۔ آج اس معمول کے درہم برہم ہونے کی وجہ سے رات دیر سے سونا تھا۔ یہ پہلی رات تھی جب میں خاصی دیر سے گھر آیا تھا۔ دراصل کل شام کی نماز ہم نے

حرم میں ادا کی اس کے بعد میں حرم کا چکر لگا رہا تھا کہ میاں شفیع سے ملاقات ہوگئی اور اس نے کہا کہ اقبال سہیل ملنا چاہتا ہے اس کے ہاں چلو۔ چنانچہ میں اور میاں شفیع، اقبال سہیل کے ہاں چلدیے وہ حرم سے خاصی دور کوئی دو اڑھائی میل مکے سے باہر ایک SUBURB میں رہتا ہے۔ پہلی بار مجھے مکے کے مرکزی علاقے سے باہر نکلنے اور گھومنے کا موقع ملا کافی۔ کشادہ علاقے ہیں اور کھلی ہوا طبیعت کو فرحت بخش رہی تھی۔ چنانچہ ہم کوئی آدھ پون گھنٹہ میں اقبال سہیل کے ہاں پہنچ گئے وہ جس بلڈنگ میں رہتا ہے اس کی تین منزلیں ہیں اور ہر منزل پر دو خاندانوں کے لیے تین تین چار چار کمروں کے فلیٹ ہیں اس نے اپنی لائبریری میں بٹھایا یہ سادہ سا کمرہ تھا جس میں کوئی زیادہ اچھا اور آرام دہ فرنیچر بھی نہیں تھا۔ البتہ کتابیں اور اخبارات خاصی تعداد میں تھے درمیان میں لکھنے کی میز تھی۔ وہ دبلا پتلا نوجوان ہے۔ خشخشی سی داڑھی ہے ویسے اس کا حدود اربعہ جو میاں شفیع نے بتایا کہ ہوشیار پور کے گکے زئی خاندان کا فرد ہے خود اقبال سہیل نے بتایا کہ اس کے والد تاجر تھے اور برما میں ان کا کاروبار تھا۔ اس کی ماں آکسفورڈ کی گریجویٹ ہے اس نے ۷۵ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اور پھر انگلستان چلا گیا وہاں پڑھتا رہا۔ پیرس میں بھی پڑھا۔ اس کے بعد مشرق وسطیٰ میں مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھاتا رہا۔ آج کل مکے میں مقیم ہے۔ ویسے میاں شفیع نے بتایا کہ وہ سعودی حکومت کا ملازم ہے لیکن اس بات کو وہ چھپاتا ہے۔ دراصل اقبال سہیل نے ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے صحافی حلقوں میں بحیثیت کمیونسٹ اور سوشلسٹ دشمن صحافی کے بڑی شہرت حاصل کی تھی وہ نوائے وقت اور چٹان میں بیروت اور مکے سے DISPATCHES بھیجتا رہتا تھا جس میں ہر ترقی پسند تحریک کو یہودی تحریک کا شاخسانہ قرار دیتا تھا رات کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور اس میں بھی ہر بات کی تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ یہ یہودیوں کی سازش ہے۔ سوویت روس کی پالیسیاں یہودیوں کی مرہون منت ہیں۔ امریکہ یہودیوں کے اشارے پر چلتا ہے بنگلہ دیش یہودیوں کی SOUND STRATEGY کا شاہکار ہے اور آئندہ مستقبل میں مشرق وسطیٰ میں اسرائیل ہندوستان اور ایران کے ذریعے تمام پالیسیاں مرتب ہوں گی۔ اقبال بنگلہ دیش

SUPER POWERS کو تسلیم کرنے کا زبردست مخالف ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ آئندہ پاکستان کو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں گی اور عین ممکن ہے کہ بقایا پاکستان کے بھی حصے بخرے کرا دیں کیونکہ اسرائیل اپنی توسیع میں پاکستان کو زبردست رکاوٹ محسوس کرتا ہے اس لیے اس وقت تمام عرب ممالک کی افواج کی تربیت کا کام پاکستانی افواج کے افسران اور ماہرین ہی کر رہے ہیں اسی لیے اسرائیل کا مفاد اسی میں ہے کہ پاکستان کو یا تو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اور وہ ہندوستان کے ساتھ فیڈریشن کرلے یا پھر اس کا تیا پانچہ ہی کر دیا جائے۔ اور بلوچستان ایران کو، صوبہ سرحد افغانستان کو اور پنجاب و سندھ کو ہندوستان میں ضم کر دیا جائے۔

اس نہج پر تین چار گھنٹے گفتگو ہوتی رہی۔ اقبال سہیل ایک فن کار کی طرح مغربی رسائل اور اخبارات کے نام لے کر اور اعداد و شمار دے کر مرعوب کرتا ہے اس کے مقابلے میں دوسرا جب موقف پیش کرتا ہے تو اس سے سوال کرتا ہے کہ SOURCE OF INFORMATION کیا ہے یہی مغربی پریس یہ تو یہودیوں کی کارستانی ہے غرضیکہ مرعوب کرنے کا اسلوب اس کو آتا ہے لیکن ذرا غور سے اس کی باتیں سنی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پچاسی سے زیادہ فیصد جھوٹ کہہ رہا ہے اور دراصل وہ ایک بین الاقوامی کمیونسٹ دشمن ادارے کا ایک اہم رکن دکھائی دیتا ہے اور چٹان اور نوائے وقت نے جس طرح اس کو اچھالا اس سے ایک بین الاقوامی گروہ کی پاکستان میں ریشہ دوانیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے میاں شفیع نے بتایا کہ میرے متعلق یہاں پر اقبال سہیل کو پہلے سے علم تھا اور اسی نے میاں شفیع کو بتایا تھا کہ عبداللہ ملک آیا ہے اور احسان الٰہی ظہیر کا خط لے کر آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں سعودی حکومت کی کو میرے متعلق تفصیلی علم ہے ویسے میرا جو معلم ہے اس کے متعلق بھی یہ روایت عام ہے کہ وہ جماعت اسلامی کا حامی ہے اور اس کا بھائی یہاں وزارت اوقاف میں ڈپٹی ہے۔ ممکن ہے وہ بھی INTELLIGENCE کا کام کرتا ہو۔ یہ کام تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر حکومت اپنے حاجیوں کی INTELLIGENCE کے لیے پولیس افسران کی ایک کھیپ روانہ کرتی ہے چنانچہ ہمارے پولیس افسران بھی آئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک کے پولیس افسران موجود ہیں کیونکہ یہ بین الاقوامی اجتماع ہے اور یہاں سیاسی سرگرمیاں اگر کوئی

کرنا چاہے تو خاصی اہم سرگرمیاں انجام دی جاسکتی ہیں اور CONTACTS بھی قائم کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں حکومتیں بھی اپنے آدمی اسی لیے بھیجتی ہیں تاکہ دوسرے ملکوں کے حاجیوں کے ذریعے وہاں کے رجحانات کا پتہ چلایا جا سکے۔ اب ہمارے آدمی بنگلہ دیش والوں سے مل کر یہی چیزیں معلوم کرتے ہیں۔

اقبال سہیل سے یہ بھی تصدیق ہوئی کہ سعودی حکومت کا انحصار یہاں کے قبائل پر ہے اور قبائل شدت سے بیرونی اثرات اور عناصر کے خلاف ہیں اور سخت رجعت پسند اور جامد زندگی کے عادی ہیں۔ یہ انہی کی مخالفت تھی جس کی بنا پر مصری ماہرین اور اساتذہ کو یہاں سے نکالا گیا اور انہی کی وجہ سے مصری اثر و نفوذ زیادہ نہیں پھیل سکتا۔

اس وقت عشاء کی نماز ادا کر چکا ہوں اور حرم میں بیٹھا ہوں۔ آج دن بھر خاصی گرمی رہی لیکن پھر بادل اُمڈنے لگے اور بوندا باندی بھی ہوئی۔ اب اس وقت بہت ہی فرحت بخش ہوا چل رہی ہے۔ دراصل مکّہ کا موسم سخت دھوکے باز موسم ہے کم از کم ہمیں پچھلے ایک ماہ میں یہی تجربہ ہوا۔ کبھی تو سخت گرمی پڑنے لگتی ہے اور کبھی شدید سردی کہ دو دو کمبل لینے پڑتے ہیں اور کبھی پنکھا چلا کر سونا پڑتا ہے۔

یہاں پچھلے دو دن سے بحری جہاز سے جانے والے پاکستانیوں میں کہرام مچا ہوا ہے کہ سعودی حکومت نے جہازوں کو بندرگاہ چھوڑنے سے منع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان جہازوں میں قانون سے کہیں زیادہ مسافر سوار تھے۔ چنانچہ حاجی حضرات ہزاروں کی تعداد میں جدے میں رکے ہوتے ہیں چنانچہ آج ابھی ابرار سے پتہ چلا کہ مولانا کوثر نیازی شاہ فیصل سے ملے ہیں اور ان کی منت سماجت کی ہے چنانچہ انھوں نے جہازوں کی روانگی کی اجازت دیدی ہے ویسے معلوم ہوا ہے کہ کوثر نیازی بھی آج واپس چلے گئے ہیں۔

مکّے کے ہجوم میں اب آہستہ آہستہ کمی ہو رہی ہے اور اب ہجوم کا دباؤ مدینہ میں بڑھ رہا ہے لیکن ہم جب تک مدینے پہنچیں گے امید ہے اس وقت تک مدینے میں ہجوم کا دباؤ قدرے کم ہو جائے گا۔ کیونکہ جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے وہ تو اب اپنے اپنے ملکوں کو واپس

جانا شروع ہو گئے ہیں اور پاکستانی بھی اکثر ہو آئے ہیں ویسے سعودی حکومت مدینہ میں دس روز سے زیادہ چونکہ قیام نہیں کرنے دیتی اس لیے ہجوم چھٹتا رہتا ہے اب تو مکے میں سخت بوریت محسوس ہو رہی ہے اور جو بھی ملتا ہے وہ اب واپسی کا مشتاق ہے دراصل یہاں وقت گزارنے کے لیے کوئی بھی RECREATION نہیں ہے نہ سینما، نہ تھیٹر، نہ کوئی عجائب گھر، نہ چڑیا گھر، عمارات اور تاریخی نوادرات کو بھی PRESERVE نہیں کیا گیا۔ اور تو اور انگریزی اردو کتابیں بھی یہاں کہیں نہیں ملتیں۔ کہ وہ ہی حاصل کر کے پڑھنے میں وقت گزارا جائے۔ اس لحاظ سے یہ وحشت ناک مقام ہے جہاں لے دے کے حرم ہی حرم ہے اور تو ترجمے والے قرآن بھی نہیں ملتے۔

آج اقبال میر کے ہاں بھی گیا تو وہ بھی بور تھا۔ وہاں مقبول باٹا سے ملاقات ہوئی وہ بھی واپسی کے لیے مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اب کے حاجیوں کی تعداد میں اضافہ کر کے ہر ایک کو اتنا پریشان کیا گیا ہے کہ ہر ایک مضطرب و پریشان ہے۔ اب جنھوں نے ہوائی سفر کے اخراجات برداشت کیے ہیں ان کا مقصد تو جلدی فارغ ہونا تھا اسی لیے انھوں نے یہ اخراجات برداشت کیے تھے۔ لیکن ان کو بھی اب کے ڈیڑھ دو مہینے رکنا پڑ رہا ہے اب وہ مضطرب نہ ہوں تو کیا ہوں۔

۲۳/ جنوری

منگل کا دن ہے تہجد کی اذان ابھی نہیں ہوئی لیکن چند لمحوں میں ہونے والی ہے میں نے اٹھ کر چائے تیار کر لی ہے اور عائشہ کو اٹھا دیا ہے اور وہ پیشاب کے لیے گئی ہے۔ چائے کی اس کو شدید عادت ہے۔ وہ اگر سب سے پہلے چائے نہ پیئے تو سخت مضمحل اور مضطرب رہتی ہے جس طرح اکثر لوگ اٹھتے ہی سگریٹ یا حقہ کی طرف دوڑتے ہیں اور اس وقت تک ان کے قویٰ کام نہیں کرتے

جب تک کہ سگریٹ کے ایک دو کش ان کے اندر نہیں جاتے بالکل یہی حال عائشہ کا ہے چائے کے بعد وہ چاک و چوبند ہو جاتی ہے اور پھر وہ دن بھر کی تگ و دو کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیتی ہے اس کا یہ حال کافی عرصے سے ہے لندن میں بھی اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہوتا تھا کہ میں صبح اٹھ کر چائے بنا دیا کروں۔ لاہور میں بھی یہی اصرار ہوتا تھا اس لیے کہ وہ خود چائے نہیں بنا سکتی اور کہ چائے کے بغیر اس کے قویٰ ہی کام نہیں کرتے۔

میری رات خاصی خراب گزری نیند بالکل نہیں آئی اور اس وقت بھی طبیعت بوجھل ہے دراصل رات عشاء کے بعد ہم حرم میں ہی بیٹھے رہے کل ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم ایک ہی وقت کھانا کھائیں گے۔ کیونکہ ہم نے کچھ زیادہ ہی کھانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے صبح کو ناشتہ کیا اور ظہر کے بعد عائشہ نے تین پراٹھے پکائے جو شلغم سے ہم نے کھائے یہ کھا کے تقریباً عصر کے قریب میں ایک گھنٹہ بھر کے لیے سو گیا۔ اس کے بعد شام کی نماز کے لیے ہم حرم میں گئے وہاں عشاء تک بیٹھے رہے جب عشاء کے بعد نکلے تو WINDOW SHOPPING کرتے رہے کہ اقبال، وقار اور ان کی بیگمات مل گئیں انھوں نے یہاں کی مرغوب DISH کھلوائی یہاں کی یہ DISH لمبے بن کو قدرے کھو کھلا کر کے اس میں گوشت کے بہت چھوٹے چھوٹے قتلوں مرچ مصالحے، چٹنی اور سلاد سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ بن خاصا لذیذ ہو جاتا ہے اور چٹخارے دار بھی اور ایک ریال اس کی قیمت بھی ہوتی ہے۔ وہ رات ہم نے کھا لیا۔ اس کے بعد ہم نے انناس کا ایک ڈبہ خریدا اور وہ کھایا۔ اس سے پیٹ کچھ بوجھل ہو گیا اور اس کی وجہ سے غالباً نیند نہیں آئی اب عائشہ حرم گئی ہے اور میں گھر پر ہی ہوں۔ اب خیال ہے کہ اگر نیند آجائے تو تھوڑا سا سو لوں۔

ناشتہ کر چکے ہیں عائشہ آتی دفعہ دو نان لے آئی تھی۔ کچھ نان مکھن اور جام اور کچھ اچار مرچوں کے ساتھ کھا لیا۔ اس کے بعد چائے پی لی۔ اس کے بعد میں نے برتن مانجھے اور عائشہ نے صفائی کی۔ اس کے بعد بازار سے سودا لایا ہوں اور ڈاک دیکھنے گیا تھا۔ لیکن کوئی خط نہیں آیا عائشہ خط کے نہ آنے سے اور یہاں رہتے رہتے تنگ آگئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بات بات

پرالجھتی ہے اور بار بار کہتی ہے جاؤ دیکھو تاریخ بدلی جاسکتی ہے کہ نہیں - اب میں سمجھا سمجھا کہ تنگ آگیا ہوں کہ نہیں ہوسکتا - اگر اب ہو بھی جائے تو پھر مدینے میں چالیس نمازوں والی بات پوری نہ ہوسکے گی - لیکن اب وہ چالیس نمازیں بھی چھوڑنے پر تلی ہوئی ہے - محرم کی یہ پریشانی جو ہے اس کی کوئی قیمت نہیں کوشش کرتا ہوں کہ وہ بہلی رہے - اس کو تسلی دیتا ہوں لیکن وہ کبھی ٹھیک ہوجاتی ہے اور کبھی پھر اصرار شروع ہوجاتا ہے - اللہ کرے کہ یہ دن گزر جائیں وہ کسی سے کوئی بات سنتی ہے تو اس کے پیچھے ہوجاتی ہے کہ تم بھی یہ کرو اب کچھ لوگوں کے پاس FREE MOVEMENT کا پرمٹ ہے - اب یہ تمام وہ لوگ ہیں جو تجربہ کار تھے اور انھوں نے پہلے سے تیاریاں کی ہوئی تھیں وہ وہاں سعودی عرب کے سفارت خانے سے پرمٹ لے آئے ہیں - اب میں بھی تھوڑی کوشش سے لے سکتا تھا لیکن مجھے نہ آنے کا پتہ تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا علم تھا کہ یہاں ایک شہر سے دوسرے شہر جانے پر بھی پابندی اور ٹیکس ہے یہ تو مجھے یہاں آکر تجربات ہو رہے ہیں اب جس وقت بیگم یہاں یہ باتیں سنتی ہیں تو وہ فوراً پھسل جاتی ہیں - دوسرے گھر سے حج کے لیے نکلے ہیں ہزاروں روپیہ خرچ بھی کر دیا ہے - لیکن وقفے وقفے کے بعد اعصاب پر روپیہ سوار ہوجاتا ہے کہ اتنا روپیہ خرچ ہوگیا ہے پھر ایک ایک ریال کے خرچ کرنے پر الجھنے لگتی ہیں غرضیکہ محرم کو جو ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اس کا حساب کتاب کوئی نہیں رکھ سکتا یہ حج کے فرائض کی ادائیگی میں جو صعوبتیں ہیں ان سے بالکل الگ ہیں - ان کو سہتے سہتے کئی بار آنسو نکل آتے ہیں -

اس وقت عشاء کے چار فرض ہوچکے ہیں اور میں جماعت سے فارغ ہوکر حرم میں بیٹھ کر ہی یہ سطور لکھ رہا ہوں - آج حرم میں کافی وقت گزرا - میں صبح قبل از دوپہر سے گھر سے تیار ہوکر نکلا اس لیے کہ عائشہ اکیلی ہی حرم میں آگئی تھی اور میں سفارت خانے گیا تاکہ وہاں اخبارات دیکھوں اور احسن سے اگر مل سکوں تو پتہ کروں کہ جہاز کی نشستوں میں کچھ تبدیلی ہوسکتی ہے یا نہیں - لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ اخبارات تو آ ہی نہیں رہے اور احسن حرم گئے ہوئے ہیں - اس کے بعد میں حرم میں آگیا - پہلے احسن کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن حرم میں ڈھونڈنا کون سا آسان کام ہے - لیکن افسران کا طریقہ

ہوتا ہے جیسے میٹنگ اور کانفرنس ایک مستقل بہانہ ہے اسی طرح یہاں افسران کے لیے ایک مستقل عذر ہوتا ہے کہ وہ حرم گئے ہیں خیر میں آکر اُوپر کی چھت پر اپنی مستقل جگہ پر بیٹھ گیا اور کالا باغ والی کتاب کے متعلق ڈیڑھ دو صفحے لکھے کہ اتنے میں اقبال ٹرانسپورٹر آگئے ان سے گپ ہوتی رہی یہاں چونکہ پاکستان سے خبروں کے حصول کا کوئی باقاعدہ ذریعہ نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہاں افواہیں سینہ بسینہ چلتی ہیں اور وہ مصدقہ خبروں کا روپ دھار لیتی ہے اب ان افواہوں جن کو خبر کے طور پر پھیلایا جاتا ہے کی تصدیق یا عدم تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت حال سے وحشت ضرور پھیلتی ہے۔ آج مثلاً تین چار خبریں میں نے سنیں۔ پہلی تو یہ تھی گورنر پنجاب غلام مصطفےٰ کھر کو گولی لگی ہے لیکن وہ بچ گیا ہے دوسرے لاہور اور کراچی میں گڑبڑ کے بعد کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے تیسرے کراچی کا تاج سینما مظاہرین نے نذر آتش کر دیا ہے اس سے پہلے کافی دن یہ خبر گشت کرتی رہی کہ ایر مارشل اصغر خاں کو حکمران جماعت نے ہلاک کروایا ہے وغیرہ وغیرہ یہاں خبریں ایک دم پھیل جاتی ہیں۔ اور دیکھتے دیکھتے ہر پاکستانی کے لبوں پر وہی خبر ہوتی ہے یہ کس طرح سے پھیلتی ہے اور کون اس کو ہوا دیتا ہے یہ بھی ایک تحقیق طلب معاملہ ہے۔

اقبال سے گپ ہو رہی تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک بھٹی ہیں میں ان کو نہیں جانتا یا پہچانتا تھا لیکن وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی گپ میں شامل ہو گئے وہ بحری جہاز سے آئے ہیں اور انھوں نے بحری جہاز سے آنے اور یہاں پہنچنے کے بعد کی جو دل دہلا دینے والی داستان سنائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ داستان لکھ کر دیں۔

اب چاروں طرف حکومت کو کوسا جا رہا ہے کہ اس نے اتنی تعداد میں حاجی بھیج کر حاجیوں کو سخت مصائب میں مبتلا کیا ہے۔ اب جن حاجیوں کو یہاں لا کر یہ سمجھا گیا تھا کہ سیاسی طور پر یہ حکومت کے حامی و مددگار بنیں گے وہی اب واپس جا کر اس حکومت کے سب سے زیادہ مخالف ہوں گے اس نوے ہزار میں سے کم از کم پانچ دس ہزار کو تو اس حج کی پوری INSTITUTION مشکوک نظر آنے لگ گئی ہوگی۔ کیونکہ میری کافی لوگوں سے باتیں ہوتی ہیں اور وہ ان شکوک کا قدرے اظہار بھی کرتے ہیں۔

۲۴ر جنوری

آج بدھ کا دن ہے اور ظہر کی نماز میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں اور ہم حرم میں پہنچ گئے ہیں وہی اُوپر کی چھت پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہیں اس وقت اُوپر کی چھت قریب قریب خالی ہے اب وہ ہجوم چھٹتا جا رہا ہے عائشہ قرآن شریف پڑھ رہی ہے اور میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ آج صبح کے معمول میں پھر فرق آ گیا۔ اس لیے کہ میں رات کو پھر نہ سو سکا۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ اب رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آتی شاید اس لیے کہ میں نے اب کافی دنوں سے سیر نہیں کی اور تھکان کم ہوتی ہے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی چنانچہ جب تہجد کی اذان ہوئی تو میں اس سے بہت پہلے اٹھ بیٹھا تھا۔ اور اپنے چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا نیچے کا تماشا دیکھتا رہا۔ اب نیچے بھی شور میں کافی کمی ہو گئی ہے لیکن پھر بھی رات بے سکونی رہتی ہے۔ چنانچہ میں نے پھر سونے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ تہجد کے لیے نہ اٹھ سکا اور عائشہ اکیلی بغیر چائے کے حرم چلی گئی اور فجر کی نماز کے بعد واپس آئی میں اٹھ کر بازار سے دودھ اور کلچہ لایا۔ اس کے بعد ناشتہ کیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ شیو کی اور اتنے میں عائشہ نے کمرے کی صفائی کر لی اور برتن مانجھ لیے اور ہم گھر سے نکل کھڑے ہوتے پہلے معلم کے ہاں گئے اس کے بعد ڈاک خانہ گئے وہاں لاہور خط پوسٹ کیا دراصل کچھ شام کی نماز سے کچھ پہلے کوثر کا لائل پور سے خط ملا۔ اس نے ۹ر جنوری کا لکھا ہوا ہے جو ہمیں ۲۲ر جنوری کو ملا۔ لاہور ہمارا خط جو ہم نے یہاں سے ۳۱ر دسمبر کو لکھا تھا چھ یا سات جنوری کو مل گیا تھا اور اس نے ۹ جنوری کو لائل پور سے خط لکھا ہے اس کے خط آنے سے بہت اطمینان ہوا۔ کیونکہ یہ لاہور سے پہلا خط ہے خط کے نہ ملنے کی وجہ سے بہت پریشانی تھی چنانچہ ہم نے اسی وقت تفصیل سے پھر جواب دیا اور مختار، سلیمان اور سرمد کو بھی خط لکھے یہ خط لکھ کر ہم پوسٹ کرنے کے لیے آتے لیکن اس وقت ڈاک خانہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ایک قہوہ خانے کے باہر بیٹھ کر ایک ایک پیپسی کولا نوش کیا۔ اور

نظارہ کرتے رہے۔اس کے بعد اٹھ کر حرم میں آئے یہاں عشاء کی نماز پڑھی اور میں نے روزنامچہ کی چند سطور لکھیں اس کے بعد گھر چلے گئے اور سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ ساتھ کے ہمسایہ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ دو دن کے لیے پانی کی قلت کے متعلق مالک مکان نے بتایا ہے چنانچہ وہ معلم کے پاس گئے تو اس نے بھی تصدیق کی اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی لائے کہ مولوی طفیل اور نوابزادہ نصراللہ خاں گرفتار کر لیے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ یہ تمام خبریں کہیں یہاں جماعت اسلامی کے حلقہ سے تو نہیں پھیلائی جا رہیں کیونکہ ہمارے معلم کا جماعت اسلامی کے حلقوں سے بہت ہی گہرا تعلق ہے اور سعودی حکومت بھی جماعت اسلامی کی بہت حد تک ہمدرد اور موید ہے اس لیے یہ تمام افواہیں کہیں اسی سوتے سے تو نہیں پھوٹتیں۔یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جماعت اسلامی کے کچھ زعماء بھی یہاں آئے ہوئے ہیں۔اور وہ سب ہمارے معلم کے ہی حاجی ہیں۔ابھی ابھی میں اور عائشہ پی پی آئی کے معظم علی سے ملنے گئے تھے اس کی بیوی اور بہن بھی ساتھ آئی ہیں۔وہ آج مدینہ روانہ ہو گئے ہیں اور وہاں سے وہ سیدھے جدہ چلے جائیں گے معظم نے بتایا کہ عبدالکریم سومار بھی آئے ہوئے تھے اور وہ میرا پوچھ رہے تھے وہ کل رات واپس کراچی چلے گئے ہیں۔

ظہر کی نماز ابھی تک شروع نہیں ہوئی۔اذان بھی نہیں ہوئی مزید آدھ گھنٹہ باقی ہے میں نے اس دوران حرم کے چار چکر لگائے ہیں۔بہت دنوں کے بعد یہ ورزش کی ہے۔اب ظہر کے بعد مزید تین چار چکر لگاؤں گا تا کہ لاہور کی سیر کی عادت ٹوٹنے نہ پائے۔

اس دوران میں یہ سوچ رہا تھا اور مجھے بار بار چی گویرا کی ایک تحریر یاد آرہی تھی کہ اصل مقصد جو سوشلزم کے نفاذ سے حاصل کرنا ہے وہ ہے نئے انسان کی تخلیق۔دراصل ہر تحریک کا بنیادی مقصد تو واقعی نئے انسان کی تخلیق ہونی چاہیے۔اب اسلام کا بنیادی مقصد بھی نئے انسان کو جنم دینا ہے۔یہ تمام عبادات۔یہ تمام دعائیں، یہ اللہ کا خوف اور ڈر، اس کے ترحم اور اس کی شفقت سے مقصود نئے انسان کی نشوونما تھی۔لیکن آج اسلام جہاں پر بھی نافذ ہے وہاں بھی نیا انسان دور دور تک نظر نہیں آتا۔جو نظام انسان کی کمینگی، انسان کا لالچ، انسان کی ہوس یہ آلائشیں دور نہیں کرتا وہ تحریک یا نظام کس کام کا۔یہ درست ہے کہ اگر سوشلزم یا اقتصادی بہتری مہیا ہو تو ایک بہتر معاشرے کی بنیاد پڑنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔لیکن سوشلسٹ ممالک

ہیں بھی تو وہ انسان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ کیوں ؟ ۔ کیا وجہ ہے انسان کی تبدیلی ماہیت میں کتنا عرصہ درکار ہے ۔ اب سوویت روس کو وجود میں آتے نصف صدی گزر چکی ہے لیکن وہاں پر بھی مثالی معاشرہ وجود میں نہیں آسکا۔ یہ درست ہے کہ صنعتی ترقی ہوئی ہے عوام کا معیار زندگی بہت بلند ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود INEFFICIENCY اسی طرح ہے ڈاک وہاں پر مدتوں میں پہنچتی ہے ۔ گھٹن ہے ۔ کیا پچاس سال کی پرولتاری آمریت مثالی معاشرے کی بنیاد کے لیے کافی نہیں ؟ خیر یہاں سعودی عرب میں تو دور دور بھی نئے انسان کا کہیں پتہ نہیں ۔ یہاں تو صنعتی ترقی بھی نہیں روٹی روزگار کی ضمانت بھی نہیں۔

ہمارے ہاں آج کل کمیونسٹ ممالک میں سے عوامی جمہوریہ چین کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں ۔ ان تعریفوں کو سن کر خوشی ہوتی ہے ۔ لیکن ہنسی بھی آتی ہے کہ ہم جب چین کی تعریف کرتے تھے تو ہم گردن زدنی ٹھہرتے تھے ۔ لیکن آج چین کی جو تعریف ہو رہی ہے اس میں چین کے نظام زندگی کی سچائی اور صحت کی وجہ کم ہے ۔ اس کی ہندوستان دشمنی کی وجہ زیادہ ہے اور یہ ایک گونہ حُبِ علی نہیں بغضِ معاویہ ہے ۔

دوسری وجہ جو کمیونسٹ چین کو محبوب بناتی ہے وہ وہاں کی مشرقیت ، سادگی اور ان کا روایتی اخلاق ہے ۔ سوویت روس چونکہ ایک یورپی ملک ہے اس میں ہمیں تمام یورپی انداز دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ہم چین جاتے ہیں تو ایک قسم کی یونیفارم ، لپ سٹک ناپید ہے ۔ چھاتیاں اُبھری ہوئی نظر نہیں آتیں ۔ یہ سب باتیں ہماری مشرقی یعنی جاگیرداری ذہنیت کو بہت متاثر کرتی ہیں لیکن ہمارے ہاں ابھی تک جو دانشور چین سے متاثر بھی ہوتے ہیں وہ اس کمیونزم سے کم اور اس کی ہندوستان دشمنی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اب تو یہ عمل اور بھی زیادہ بہتر ہو گیا ہے کیونکہ ہم کو تمام ذرائع سے یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ پاکستان کو دولخت کرنے میں سوویت روس نے اہم کردار ادا کیا ہے اس لیے اس کے خلاف ہماری نفرت اور تیز ہو گئی ہے اور جیسے جیسے یہ نفرت تیز ہوتی ہے ویسے چین اور بھی پیارا لگنے لگتا ہے کیونکہ چین سوویت روس کو زبردست گالی دیتا ہے ، اس کو سوشل سامراج پکارتا ہے اور اس طرح سے ہم روس کے خلاف نفرت کی تشفی عوامی جمہوریہ چین سے محبت کا اظہار کر کے کر لیتے ہیں اس عمل

کو ہمارے حاکم بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی بھی کئی ایک وجوہات ہیں۔

اولاً ہمارے حاکم یہ نہیں چاہتے کہ بنگلہ دیش کی تخلیق کی تحریک کی پشت پر کام کرنے والے تمام عوامل پر کھلے بندوں بحث ہو اس لیے ان کی خواہش یہی رہتی ہے کہ تمام کا تمام الزام سوویت روس اور ہندوستان کی جارحیت پر ڈال کر اپنے کو صاف بچا لیا جائے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی جارحیت برحق۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں لیکن اس جارحیت کے لیے زمین ہموار کرنے میں پوری مدد کس نے دی اور یہ تو کوئی ایک دن کی بات نہیں اس کے پیچھے تو دو دہائیوں کی غلط سیاست کار فرما رہی ہے لیکن حاکموں کے پاس ذرائع ابلاغ ہوتے ہیں وہ سالہا سال تک جھوٹ کو سچ کہہ کر پیش کر کے رائے عامہ کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کا جھوٹ ہی اصل سچ ہے اور اس دور میں سچ بولنے والے جھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ اب کون بتائے کہ میاں افتخار الدین، خدا اس کو مغفرت کرے اور کروٹ کروٹ جنت ملے، نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی تھی اور اس نے ایک ربع صدی پہلے اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ مشرقی پاکستان کو خود مختاری دی جائے اور پاکستان میں کنفیڈریشن قائم کی جائے کیونکہ کسی بھی خطے کو جبراً ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کو اس کی رضامندی، پیار اور محبت کے ساتھ ہی قومی وحدت میں پرو دیا جا سکتا ہے اور یہ ایک سیاسی عمل ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ اس خطے کے بسنے والوں کی خواہشوں اور تمناؤں کا احترام کیا جائے لیکن یہ احترام ان کے حقوق کو تسلیم کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی بنیاد ہی عوام اور خطوں کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس قومی وحدت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مختلف قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے اور اس کے لیے سوشلزم ہی واحد بنیاد بن سکتا ہے اس لیے ہمیں چاہیے سوویت روس نے جس انداز سے قومی مسئلے کو حل کیا ہے اور وہاں کی درجنوں قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کر کے ان کو قومی وحدت کی لڑی میں پرو دیا ہے اس کا بنظر غائر مطالعہ کریں وگرنہ سرمایہ داری نظام خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو وہ یہ مسائل حل نہیں کر سکتا برطانیہ جیسی ترقی یافتہ جمہوریت اگر آئرش مسئلہ حل نہیں کر سکتی تو ہم لیپا پوتی اور تشدد سے بلوچستان کا مسئلہ کیسے حل کر سکتے ہیں یہ حقائق ایسے ہیں جو ایجی ٹیشن اور تقریروں سے حل نہیں

ہو سکتے اس کے لیے تاریخ کے عمل کو اور اس کے پیچھے کام کرنے والے عوامل کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے ہم آج تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم بلوچستان میں فیوڈل ازم ختم کر رہے ہیں۔ لیکن فیوڈل ازم ختم کر کے ایک تاجر اور نیا سرمایہ دار طبقہ پیدا کر رہے ہیں جو کل کو جب جوان ہوگا تو وہ جاگیرداروں سے بھی زیادہ علیحدگی پسند ہوگا اور کیا ہم نے بنگلہ دیش کے تجربے سے کوئی سبق نہیں سیکھا

عصر کی نماز ہو رہی ہے اور گھر پر ہی ادا کی ہے ہماری پوری بلڈنگ میں پانی کے ہاتھوں ہاہا کار مچی ہوئی ہے پانی کا ایک قطرہ نہیں ہر کوئی پریشان ہے معلم کا کہنا ہے کہ ٹھیک ہو جاتے گا ایک دن کی تکلیف ہے۔ لیکن یہاں پر رہنے والے حاجیوں کا خیال ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے یہ مزید ریال بٹورنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ بہر حال طے ہوا کہ عصر کی نماز کے بعد تمام مل کر معلم کے ہاں چلیں گے۔ دیکھیں کیا ہونا ہے۔ یہاں پر سب نے ہزاروں ریال فقط پانی اور بجلی کے آرام کے لیے خرچ کیے ہیں لیکن اب آخری دنوں میں یہ تکلیف دیکھنے میں آ رہی ہے۔

آج جب ظہر کے بعد گھر پہنچے تو تسنیم کا عید کارڈ ملا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے اس سے پہلے بھی خط لکھا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ ایک دو دن میں مل جائے گا۔ گھر سے خط آنے کے بعد طبیعت خاصی بشاش ہو جاتی ہے اور اداسی دور ہو جاتی ہے۔ کل جدے جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں اس لیے کہ تنزل ٹیکس سے معافی اگر مل جائے تو دو سو ریال بچ سکتے ہیں۔

۲۵، جنوری

آج جمعرات ہے اور فجر کی نماز ہو چکی ہے میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں نیچے بازار میں حرم سے آنے والے نمازیوں کا شور ہے۔ عائشہ حرم گئی ہوئی ہے ہم تہجد کی اذان پر ہی اٹھ بیٹھے ہیں۔ میں نے چائے بنائی اس نے وضو کر کے تہجد کے نوافل ادا کیے اور اس کے بعد چائے پی کر حرم چلی گئی میں نے اس کے بعد سونے کی کوشش کی لیکن سو نہ سکا۔ دراصل پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ اب رات کی نیند بالکل اڑ گئی ہے اور تمام رات

بے چینی اور بے سکونی سے گزرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صبح دم نیند آنے لگتی ہے تو پھر تہجد کے موقع پر اٹھنے ہوئے قدرے دشواری اور تکلیف ہوتی ہے۔ پہلے یہ عالم نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت نیچے رات بھر شور اور ہنگامہ اس سے کہیں زیادہ رہتا تھا۔ یہ میرا عالم ہی نہیں عائشہ بھی اس امر کی شاکی ہے عائشہ کو تو رات بھر تکلیف رہی۔ سرِشام ہی اس کا گلا دکھنے لگ گیا اور کان تک ٹیس اٹھنے لگی۔ حتیٰ کہ رات کو اس نے کوکا کولا پینے کی کوشش کی تو وہ بھی نہ پی سکی۔

میں نے لیٹنے کی ابھی کوشش کی لیکن نہیں سو سکا اور اٹھ کے میں نے سعودی حکومت کے وزیر اوقاف سے انٹرویو کے لیے تقریباً دس سوال تیار کیے اس کے بعد غسل خانے گیا۔ پانی کی سخت تکلیف ہے۔ آج جدّے جاکر وزیر اوقاف سے ملنے کا ارادہ کر رہا ہوں وہاں جدّے میں دوسرے افسران وغیرہ سے بھی ملنے کی کوشش کرونگا۔ دراصل طبیعت سکون، آرام کی اتنی عادی ہوگئی ہے کہ اب معمول میں تھوڑا سا فرق آنے لگتا ہے تو طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ اب مثلاً جدہ جانا ہے تو خواہ مخواہ طبیعت میں ایک قسم کی بے چینی ہے ویسے میری یہ حالت کافی دنوں سے ایسی ہوگئی ہے اور طبیعت میں کسی زمانے میں جو ADVENTURE کی حس تھی اور جذبہ تھا وہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ یہ اسی کا خاصہ تھا کہ میں یورپ کا آتی دفعہ پورا چکر بھی نہ لگا سکا صرف یہی نہیں بلکہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے اس قدر ATTACH ہیں کہ اب جدا ہوتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔

۲۶ جنوری

آج جمعہ ہے اور اس وقت جمعہ کی نماز میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہے لیکن میں اُوپر کی چھت پر آبیٹھا ہوں دراصل پچھلے جمعہ کو ہجوم کا جو تجربہ ہوا اس نے ڈرایا ہوا تھا۔ لیکن آج تو اوپر کی چھت قریب قریب خالی ہے اگر دو تین ہزار نمازی ہوتے بھی تو وہ اس وسیع و عریض مسجد کی چھت کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ عائشہ ابھی تک نہیں پہنچی وہ ہانڈی پکا رہی تھی لیکن مجھے دو خط پوسٹ کرنے تھے اس لیے میں پہلے

چلا آیا اور اب خط پوسٹ کر کے آ رہا ہوں۔

کل کا سارا دن تو جدے آنے جانے میں غارت ہوگیا اور اس کے بعد اتنی تھکان اور گرمی لگی کہ بالکل بے جان ہوگیا اور لکھنے پڑھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی یہ جدے کی روداد بھی خاصی دلچسپ ہے صبح کوئی آٹھ نو کا عمل ہوگا جب میں گھر سے نکلا حرم کے پاس گیا کہ وہاں سے سواریاں جاتی ہوں لیکن خاصا پریشان ہوا اور کوئی ٹیکسی جدے نہیں جا رہی تھی۔ پھر ایک ہندی جس نے عربی جبہ پہنا ہوا تھا اور عربی بھی بولتا تھا اس نے مجھے روک کر اردو میں بتایا کہ اس جگہ نہیں بلکہ فلاں جگہ سے جدے کے لیے ٹیکسیاں ملیں گی۔ اس جگہ پہنچا تو وہاں بھی ناکامی۔ کیونکہ ایک سواری بٹھانے کو کوئی تیار نہ تھا حاجی حضرات کے گروپ پوری ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ پولیس والے سے کہا اس نے مجھے ایک بس میں بٹھا دیا اب مجھے معلوم نہیں کہ یہ بس کدھر جا رہی ہے کیونکہ جس وقت میں بس میں بیٹھا تو وہ بالکل خالی تھی۔ پھر اس کے بعد آوازیں لگنی شروع ہوئیں تو مجھے احساس ہوا کہ یہ لوکل ہے۔ اس نے بالآخر ایک جگہ مجھے اترنے کے لیے کہا اور کہا کہ وہاں سے جدے کے لیے ٹیکسیاں ملتی ہیں چنانچہ میں نے چار قرش اس کو دیے اس نے طلب ہی چار قرش کیے تھے۔ یہ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک جگہ سے دوسرے علاقے میں مقامی طور پر چار قرش کا کرایہ وصول ہوتا ہے۔ یہاں بہت سی ٹیکسیاں اور تھیں جو جدے کے آوازے لگا رہی تھیں ہم چار ایرانی اور ایک میں ایک ٹیکسی میں بیٹھے ان سے تین ریال فی کس طے ہوا لیکن جس وقت بیٹھ گئے تو ٹیکسی والا پانچ ریال کا مطالبہ کرنے لگا ہم اتر گئے اور ایک وین میں بیٹھ گئے اس نے تین ریال فی کس لینے طے کیے اس میں بارہ سواریاں بیٹھیں نشستیں لکڑی کی تھیں لیکن بہرحال چارہ کار اور کچھ نہ تھا۔ چونکہ ریال بچانا یہاں بہت ضروری ہے اس میں چار ایرانی چار پاکستانی اور ایک سیلون کا باشندہ تھا۔ راستے میں چیکنگ پوسٹ آئی۔ وہاں میں نے تو اپنا پاسپورٹ بطور امانت رکھ دیا ورنہ وہ ساڑھے گیارہ ریال ٹرانزٹ کا ٹیکس لے لیتے ہیں دو پاکستانیوں نے پچاس ریال بطور ضمانت کے رکھے اور پاسپورٹ ساتھ لے گئے۔ وین کافی تیز چلی اور راستے میں دو پاکستانی جو تھے وہ دونوں گوجرانوالہ کے تھے اور مجھے بحیثیت سوشلسٹ کے جانتے تھے ان میں ایک کشمیر کا باشندہ تھا۔ اور اب گوجرانوالہ میں آباد ہے۔ وہ خلوص سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ جلدی قوت سوشلزم کے لیے

خرچ کی ہے اب آئندہ اسلام کے لیے خرچ ہو انسانی دعاؤں اور خواہشوں میں کتنا خلوص ہوتا ہے ان سے راستہ بھر سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں اب آہستہ آہستہ بحث سے گریزاں ہونے لگا ہوں اور دوسروں کی سنتا رہتا ہوں۔ اپنی بات پر اصرار نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے موقف کی صحت کے بارے میں زیادہ شدت اختیار کرتا ہوں۔ یہ دونوں پاکستانی تاجر پیشہ تھے ان میں سے ایک نے بتایا کہ یہاں پر سچے موتی پاکستان کے مقابلے میں سستے ہیں ویسے بعض اشیاء یہاں پر کام کی ہیں۔ اگر پیسے ہوں تو لے جائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً میں نے یہاں ٹرانسسٹر اور آٹومیٹک ٹیپ ریکارڈر دیکھے ہیں۔

ظہر سے ڈیڑھ پونے دو گھنٹے پہلے جدہ پہنچے اس نے سٹی ایر پورٹ ٹرمینل پر اتار دیا۔ وہاں ٹیکسیاں بے شمار تھیں۔ ایک ٹیکسی والے سے سعودی عرب کی وزارت حج چلنے کے۔ لیے چار ریال پر بات طے ہوتی اس نے کوئی بیسیوں لوگوں سے وزارتِ حج کے دفتر کا پتہ پوچھا۔ لیکن معلوم نہ ہوا۔ بہرحال خاصی پریشانی کے بعد اس نے وزارتِ حج کا دفتر ڈھونڈ نکالا اور میں اتر کر اس کو پیسے دینے لگا تو وہ پانچ ریال پر ضد کرنے لگا لیکن میں نے بھی اس کو ڈانٹ دیا اور دس ریال کا نوٹ دیا تو اس نے بالآخر چھ ریال واپس کر دیے اس کے بعد مختلف دفتروں سے ہوتا ہوا وزیر کے پاس پہنچا۔ وہ انگریزی جانتا تھا کوئی زیادہ گرمجوشی نہیں تھی وگرنہ ہمارے ہاں بیرونی نامہ نگار کے لیے خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ بہرحال اس نے اپنے ایک اسسٹنٹ کو جو پاکستانی تھا۔ اور رابطہ والے انعام اللہ کا لڑکا تھا، اس سے ملایا اس باتیں ہوئیں اس نے میرے سوالات رکھ لیے اور جو ان کے پاس لٹریچر تھا وہ مجھے دیدیا میں نے FREE MOVEMENT کے پرمٹ کے لیے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا اختیار اب پولیس کے محکمہ کو منتقل کر دیا گیا ہے میرے پاس شمیم کے بھائی کا فون نمبر تھا۔ میں نے وزارت میں کہا کہ اس جگہ ٹیلیفون کرنا ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ تو پرانا نمبر ہے اب DIGITS بدل گئے ہیں۔ اس کے بعد بہتری کوشش کی کہ نئے ٹیلیفون نمبر کا پتہ چل جائے لیکن کام نہ بنا۔ انعام اللہ کا لڑکا خالد کہنے لگا کہ یہاں پر تو زندگی ابھی ایسی ہی ہے ویسے یہ کے دور میں تو داخل ہو چکے ہیں۔ لیکن زندگی کی ترتیب بدلتے ہوتے ابھی خاصی مدت لگے گی۔ اور تو اور شمیم کا بھائی

AGRICULTURAL DEVELOPMENT کارپوریشن میں ہے اس کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ خود وزیر صاحب کو اس کا علم نہیں تھا۔ مجبور ہو کے وہاں سے نکلا خالو نے کمال مہربانی سے مجھے راستہ ہی نہ سمجھایا بلکہ اس نے ٹیکسی والے کو بلا کر بتا دیا اور مجھے کہا کہ وہاں پہنچ کر اسے تین ریال دے دیجیے چنانچہ میں نے پاکستانی حج آفس پہنچ کر ٹیکسی والے کو تین ریال دے دیے اور وہاں میں نے اپنا ٹکٹ ڈھونڈا ٹکٹ جلدی مل گئے۔ اس کا اندراج عائشہ کے پاسپورٹ پر بھی کروایا۔ باہر نکلا وہاں پورے دفتر میں حاجی بے چارے پریشان حال پھر رہے تھے۔ ایک نوجوان ایک افسر سے جھگڑ رہا تھا۔ میں رک گیا اور معاملہ معلوم کیا تو پی آئی اے میں چار سواریاں جن کی ۲۴ جنوری کی نشستیں ریزرو تھیں وہ تمام دن ایر پورٹ پر بیٹھی رہیں لیکن ان کو بٹھائے بغیر جہاز روانہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جگہ اور لوگوں کو نشستیں دے دی گئیں یہ واردات سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ائیر لائنز میں بھی یہ بددیانتی ہونے لگی تو معاملہ کہاں پر جا کے رکے گا اور سفر کا بھی کوئی تحفظ نہیں رہے گا۔

وہیں حج آفس سے میں نے واپس مکہ پہنچنے کے لیے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ سامنے سے بس پر بیٹھ کر مکہ کے لیے ٹیکسی سٹینڈ پر اتر جائیے وہاں سے ٹیکسی مکہ کے لیے مل جائے گی۔ یہ وہی ٹیکسی سٹینڈ تھا جہاں صبح ہم کو اتارا گیا تھا۔ لیکن ایک سواری کو کوئی نہیں بٹھاتا تھا ایک ٹیکسی والے نے چار ریال مانگے۔ میں نے تین کہا۔ اس نے بٹھا لیا اور چل دیا۔ میں سمجھا کہ اور سواریاں بٹھائے گا یا اس کو ہر حال میں مکہ پہنچنا ہو گا۔ لیکن وہ مجھے ہوائی اڈہ پر لے گیا میں نے کہا کہ مکہ، تو اس نے کہا کہ "لا"۔ میں نے بھی یہاں جھگڑا کیا کہ میں کوئی پیسے نہیں دوں گا۔ آخر میں نے وہاں سے ایک اور ٹیکسی لی اور اس کو دو ریال دیے اور واپس ٹیکسی سٹینڈ پر آیا۔ یہاں سے خدا خدا کر کے دو اور سواریاں جا رہی تھیں ان کے ساتھ مل کر ٹیکسی لی اور میں نے چھ ریال دیے اور حرم کے قریب آ اترا۔

مکے سے جدہ جاتے ہوئے یا جدہ سے مکہ آتے ہوئے صحرا کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے لق و دق صحرا جس میں ریت اڑ رہی ہے اس میں خاصی بہترین چوڑی، صاف وشفاف سڑکیں جن پر اسّی، نوّے میل گاڑی بڑے مزے سے چلتی ہے۔ لیکن اب جگہ جگہ تعمیرات ہو رہی ہے

اور اگر کبھی پانی کا مسئلہ حل ہو گیا تو یہ صحرا لالہ زار بن جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود جدہ اور یہ راستہ دیکھ کر ترقی کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ جدہ بالکل کوئی ماڈرن یورپی شہر بنتا جا رہا ہے صدہا منزلہ سربفلک عمارتیں، ہوٹل، دفاتر DEPARTMENTAL STORES وجود میں آرہے ہیں۔ پرانا جدہ جلدی ملبے کے نیچے دبتا جا رہا ہے اور اسکی جگہ نیا جدہ تعمیر ہو رہا ہے اور یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ فیصل نے بدوؤں کو اونٹ کے دور سے نکال کر جیٹ کے دور میں داخل کر دیا ہے، اتنا بڑا انقلاب بپا ہو رہا ہے لیکن خون خرابے کے بغیر بہرحال اس وقت محسوس نہیں ہو رہا۔ لیکن سعودی عرب میں جس تیزی سے ترقی ہو رہی ہے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تاوقتیکہ خاصا وقت نہ صرف کیا جائے لیکن اس ترقی کا اثر پوری زندگی پر پڑنا لازمی ہے اس وقت بھی عرب سول سروس میں غیر عرب خاصی تعداد میں ہیں اب ان دفاتر میں وہی لمبا کرتہ اور چوغہ پہنے کام ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے کام کی رفتار بڑھے گی اور کام کا دباؤ EFFICIENCY کا تقاضا کرے گا تو یہ لمبا کرتہ، چوغہ وغیرہ غائب ہوتے چلے جائیں گے اور ان کی جگہ پتلون یا کوئی اور چست قسم کا لباس وجود میں آئے گا۔ لباس بھی تو آخر آب و ہوا، طرز زندگی کی ضرورتوں کی تشفی کرتا ہے۔ یہ لباس گرم ریتلے علاقوں اور بدوؤں کی زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ اب جیسے جیسے وہ زندگی ختم ہوگی یہ لباس بھی ختم ہوگا۔ جہاں یورپ سے آئس کریم تک درآمد ہوتی ہو وہاں زندگی کو جدیدیت کے سیلاب سے کون روک سکتا ہے اب یہ سیلاب تعلیم کو موجودہ زمانے کی فنی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے پر مجبور کرے گا۔ اس وقت حدیث، فقہ اور نحو پر اصرار ہوتا ہے تو کل فزکس، کیمسٹری پر اصرار ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تعلیم مذہب سے بیگانہ کر دے گی۔ لیکن یہ تعلیم مذہب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور کرے گی اور زود یا بدیر جب اسرائیل سے عرب دنیا کا سمجھوتہ ہوگا تو اس کا IMPACT ہونا بھی لازمی ہے اس وقت بھی اسرائیل کی ترقی کا ردِعمل موجود ہے لیکن جب عملاً رابطہ قائم ہوگا تو پھر اس کے ردعمل کی رفتار میں بھی زبردست تیزی آئے گی اور اس کی چھاپ بھی زیادہ گہری اور ٹھوس ہوگی۔

نماز کا وقت قریب آرہا ہے، اوپر کی چھت قریب قریب بھرتی جا رہی ہے اسلیے اب باقی باتیں عصر کے قریب لکھوں گا کیونکہ نماز جمعہ کے بعد گھر جائیں گے مجھے اس وقت ہی بھوک محسوس ہو رہی ہے دراصل صبح ناشتہ پوری طرح نہیں کیا تھا۔

عصر کی نماز میں آدھ پون گھنٹہ باقی ہے۔ کھانا کھا کے، قیلولہ کر کے اب چاق وچوبند ہو کر بیٹھا ہوں، گھر پر ہی عصر کی نماز ادا کریں گے۔ دراصل کل سے سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ کل رات میں پنکھا ے آیا تھا ورنہ کل جدہ سے آنے کے بعد تو میرا موڈ سخت خراب تھا۔ ایک تو تھکان تھی دوسرے گرمی کی شدت، تیسرے جب میں جدہ سے واپس گھر پہنچا تو پانی پہلے کی طرح ندارد۔ اس لیے سخت وحشت ہوتی بہرصورت جدہ سے میں عصر کے قریب گھر پہنچا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اس لیے بھوک لگی ہوئی تھی۔ کپڑے بدل کر میں اور عائشہ کھانے کی تلاش میں نکلے کل یہاں پہلی بار ہم نے چرغہ کی قیمت پوچھی تو چھ ریال بتائی گئی۔ میں نے چار سیخ کباب اور ایک نان لیا یہ پونے تین ریال میں مل گئے وہیں ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا۔ اس کے بعد ایک دوسرے ہوٹل میں جا کر چائے پی اس ہوٹل کی خوبی یہ ہے کہ یہاں فرج کا ٹھنڈا پانی پینے کو مل جاتا ہے اور چائے بھی اچھی ہوتی ہے کیونکہ یہاں چائے تازہ دودھ کی ملتی ہے۔ ورنہ عام طور پر دودھ ڈبوں کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں نصف ریال کا ایک گلاس چائے کا ملتا ہے۔ یہاں ہم اب دو تین دن سے آدھ گھنٹہ گزارتے ہیں یہاں ہوا بھی بہت ٹھنڈی لگتی ہے حالانکہ یہ حرم کے سامنے گلیوں کے درمیان ہے شاید یہ گلیوں کی وجہ سے ٹھنڈا ہوتا لیکن اوپر سے کھلا ہے۔ یہاں پر حقہ نوشی کا بھی اہتمام ہے اس ہوٹل کی شاہ محمد غوث والے ہوٹلوں سے گہری مشابہت دکھائی دیتی ہے لیکن یہاں صرف چائے ہوتی ہے یا پھر کچھ مشروبات ملتے ہیں کھانے کا اہتمام یہاں پر نہیں ہوتا۔

یہاں سے اٹھے انناس کا ڈبہ خریدا اس کے بعد ڈاک دیکھنے کے لیے گئے ڈاک کوئی نہ تھی پھر گھر آگئے ہمسایوں کے ساتھ گپ ہوتی رہی اپنے کمرے میں واپس آئے تو تسنیم کا خط پڑا ہوا تھا یہ ۶ جنوری کا تھا جس کا عید کارڈ میں تذکرہ تھا اس کا شدت سے ہمیں انتظار تھا۔ خط پڑھتے رہے اتنے میں شور ہوا کہ پانی آگیا، پانی آگیا ہم نے جلدی جلدی برتن بھر کر رکھے تاکہ وقت ضرورت

کام آئیں اور عائشہ نے نہانے کی کوشش کی وہ نہا ہی رہی تھی کہ پانی چلا گیا پھر بھی تھوڑا بہت اس نے نہا لیا جس سے اس کی حالت بہتر ہوئی وگرنہ گرمی کی وجہ سے اس کی حالت بھی غیر تھی اور پسینے کی وجہ سے اس کو خود اپنے سے بُو آرہی تھی۔ شام کی نماز کے بعد ہم لیٹے ہوتے تھے کہ ہمسایوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا طاہر بیگ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ کہنے لگے کہ نئی خبر سنی ہے ؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ پاکستان میں مارشل لاء لگ گیا ہے۔ ٹکا خان نے اقتدار سنبھال لیا ہے اور بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا ہے میں ہنس دیا اور کہا کہ دل کو نہیں لگتی۔ اس کے بعد عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر میں معلم کے ہاں گیا وہاں رات گئے تک محفل جمتی ہے وہاں اس قسم کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس سے میں پنکھا لایا اور بجلی والے کو دو ریال دے کر اس کو چالو کروایا۔ اس سے گرمی کی تلخی کم ہوئی اور موڈ بھی درست ہوا۔ معلم نے بتایا کہ مدینہ ۳۰ جنوری کو اگر گئے تو کہیں واپس نہ کر دیں اس لیے ۳۱ جنوری کو ہی جانا چاہیے چنانچہ اب ۳۱ کو ہی علی الصبح جانے کا ارادہ ہے

آج ۲۶ کو تہجد کے وقت نہ اٹھا جا سکا۔ فجر کی نماز کے بعد اٹھا۔ عائشہ نے نماز پڑھی میں نے نہانے کی کوشش کی چنانچہ پانی موجود تھا نہایا تو کچھ چین آیا۔ اس کے بعد نماز پڑھی اور بازار سے سودا سلف لایا۔ ناشتہ کیا اس کے بعد شیو بنائی اور تسنیم و کوثر کو تفصیلی خط لکھا اس کے بعد شمیم کے بھائی کو بدہ خط لکھا۔ اور حرم چلا گیا اب سنا ہے کہ شورش رہا ہو گیا ہے اس کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ بے چارے نے کافی مصیبت کے دن کاٹے ہیں۔ یہاں اکثر یاد آتا رہا، ایس پی ایرار کے ساتھ حرم میں اکثر اس کا تذکرہ رہتا تھا۔

آج ہمارا حرم شریف اور مکے میں آخری جمعہ ہے۔ اب انشاءاللہ آئندہ جمعہ مسجد نبوی میں ادا کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ جمعہ کے بعد عائشہ کو اور خود مجھے بھوک ستانے لگی۔ چنانچہ ہم جلد ہی نماز کے بعد یہاں سے نکل آئے گو خاصا ہجوم تھا۔ لیکن اس کے باوجود دھکم پیل میں حصہ لے کر جلد باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ عائشہ نے جا کر روٹی پکائی۔ ہم نے یہاں سے کیرسین کا جو چولہا لیا تھا وہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس پر روٹی پکاتے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر لگ جاتا ہے چنانچہ آج عائشہ نے تنگ آکر ہمسایوں سے چولہا اور توا دونوں مانگ لیے اور جلد ہی روٹیاں پکا لیں

یہاں جب سے آئے ہیں ہم نے گوشت نہیں پکایا۔ ایک تو مہنگا ہے دوسرے یہاں کے گوشت کو دیکھ ہی کر ہی کراہت ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں سبزی یا پھر دال بہت بڑی نعمت رہی ہے چنانچہ دال اور پراٹھا یہاں بہت لطف دیتا ہے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میں نے بھی بھوک سے زیادہ روٹی کھالی اور خود عائشہ نے بھی زیادہ کھالی اس کے بعد خوب نیند کی، عائشہ تو زیادہ سوئی لیکن میں جلد ہی اٹھ بیٹھا اور یہاں کی حج وزارت کے ہاں سے جو مواد لایا ہوں وہ پڑھتا رہا اس کے بعد شورش کو رہائی پر خط ڈالنے کے لیے گئے۔ شام کی نماز کے بعد حرم سے اٹھے تو عائشہ کی طبیعت پراٹھے نے بوجھل کردی تھی۔ چنانچہ اس کو سیون اپ کی طلب ہوئی اور مجھے اپنی عینک کے فریم کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی چنانچہ ڈاک خانے کے نیچے جو مارکیٹ ہے وہاں ایک عینک والے کی دکان ہے وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ یہ پنجابیوں کی دکان ہے۔ خیر انھوں نے رعایت کی اور چودہ ریال میں فریم بدل دیا۔ اس کے بعد گیس کے چولہوں کے لیے لائٹر خریدا۔ یہ ایک طرح کی پہلی شاپنگ تھی یہ پانچ ریال میں خریدا۔ اس کے بعد سیون اپ پینے کے لیے گئے تو وہ ختم تھی چنانچہ اپنے گھر واپس آگئے اور اپنے گھر کی دکان کے سامنے سے سیون اپ خرید کر لائے اور عائشہ نے پی اس کے بعد عشار کی نماز پڑھ کے وہ سوگئی۔

۲۷، جنوری

ہفتہ کا دن ہے اس وقت شام کی نماز ہو چکی ہے اور میں حرم میں کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اذان سے پہلے ہی ہم یہاں پہنچ گئے تھے اور آج کافی دنوں کے بعد کعبۃ اللہ کے بالکل سامنے جگہ ملی ہے۔ یہاں کافی دیر میں اس عمارت کی طرف دیکھتا رہا اور غور کرتا رہا کہ کس طرح ایک چاردیواری جو تعمیر کے لحاظ سے کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ خوب صورتی میں بھی اس کو کوئی مقام حاصل نہیں لیکن ایک عالم اس کو تکتا ہے اور پوجتا ہے اس کو سلام کرتا ہے اس کو چومتا ہے اسکی دیوار دل

کے ساتھ لگ کر گریہ وزاری کرتا ہے اور یہ خلقت ہے تکتی رہتی ہے اور تھکتی نہیں اس کو سکون ملتا ہے یہ خلقت اس کو دیکھ کر مسرور رہتی ہے۔ میں بھی اس کو تکے جا رہا ہوں میں نے طواف بھی کیے ہیں گریہ وزاری بھی کی ہے لیکن حج کے بعد آج بہت دنوں بعد پھر اس کو تکنے کو جی چاہ رہا ہے۔

پچھلے دو دن سے میں سعودی عرب کے دانشوروں کے بعض مقالات جو انھوں نے کچھ عرصہ ہوا یہاں ایک بین الاقوامی مذاکرے میں پڑھے تھے وہ میں نے بھی پڑھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر مجھے سعودی عرب کے حاکموں کے سیاسی اور مذہبی موقف کا پتہ چلا ہے دراصل ان کا موقف بنیادی طور پر مختلف ہے وہ ایک اسلامی معاشرے کے داعی ہیں اور اس میں وہ موجودہ دور اس کے تقاضوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ویسے ان مقالات کو پڑھ کر ہم آہنگی اور نظریات میں یکسانیت کی بنیاد کا پتہ چلا۔ ان مقالات اور ان تحریروں سے محسوس ہوتا ہے کہ سعودی عرب کی حکومت شاہ فیصل کی قیادت میں دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی رول ادا کرنے کے لیے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ تیاری کر رہی ہے۔ سعودی عرب کے اس بین الاقوامی رول سے سیاسی سطح پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رول ادا کرنے کے لیے منصوبہ بندی ضرور کر رہی ہے اور وہ دنیائے اسلام کی قیادت کی عنان سنبھالنے کے لیے عرب نیشنلزم اور علاقائی نیشنلزم کے خلاف اسلامی نیشنلزم کا نعرہ دے رہی ہے لیکن سعودی عرب ابھی اس نعرے کو سیاسی سے زیادہ ثقافتی میدان میں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ثقافتی میدان میں CONSOLIDATION کے بعد وہ آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ ابھی وہ اتنا طاقتور نہیں ہے اور نہ ہی اسلامی نیشنلزم کی تحریک اتنی جاندار ہوئی ہے کہ وہ سیاسی میدان میں زور آزمائی کر سکے اور اس کے بعد جو مزاحمت ہوگی اس کا مقابلہ کر سکے گی یا نہیں۔ دراصل عالمی شہنشاہیت جس کی آج دنیا میں نمائندگی امریکہ کر رہا ہے اس کا طریق کار یہی ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک میں جو ترقی پسند رجحانات اور سماجی انصاف اور اشتراکیت کے حق میں جو رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ان کو روکنا مقصود ہے یہی ضرورتیں عرب ممالک کے بادشاہوں کی ہیں چنانچہ یہ قدر مشترک ہے جو ان عرب بادشاہوں اور امریکہ کو یک جا کر دیتی ہے۔ اب جو بادشاہ زیادہ مالدار زیادہ سمجھدار اور زیادہ زیرک ہوگا وہ عرب قوم پرستی اور سماجی انصاف کی تحریک کو روکنے اور مزاحمت کرنے کی

زیادہ اہلیت رکھے گا اور امریکہ اس پر قدرتاً زیادہ انحصار کرے گا۔ آج کی عرب دنیا میں یہ تمام تقاضے سعودی عرب کے شاہ فیصل پورے کرتے ہیں اس لیے وہ صرف دنیائے عرب ہیں سماجی انصاف اور سوشلزم کی تحریک کے خلاف مزاحمتی تحریک کی قیادت کرنے ہیں مصروف نہیں بلکہ آج عالمی سطح پر یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں چنانچہ آج حیرانی کی بات نہیں ہے سعودی عرب کی حکومت اپنے پیسے کے زور پر حکومتوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ چنانچہ آج جماعت اسلامی اگر سعودی عرب کی حلقہ بگوش ہے تو پیپلز پارٹی اور اس کے قائدین کو بھی سعودی عرب کے حاکموں کی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

آج کا پورا دن خاصا مصروف گزرا اور دلچسپ بھی پہلی بار یہاں کچھ RELAXATION ہوئی اور یہاں کی بوریت قدرے کم ہوتی آج صبح تہجد کے وقت اٹھا۔ عائشہ کی طبیعت زیادہ اچھی نہ تھی وہ کہنے لگی کہ تمام رات بے چینی رہی ہے اور جسم درد کر رہا ہے غالباً شوگر زیادہ آ رہی ہے میں نے چائے تیار کی اور ساتھ ہی تہجد کی نماز ادا کی۔ اسکے بعد فجر کی نماز باجماعت گھر پر ہی پڑھی۔ اس کے بعد ناشتہ کے لیے سودا لانے گیا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا لیکن کچھ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم پاکستان سے چائے کے دو ڈبے لائے تھے وہ دونوں آج ختم ہو گئے تھے چنانچہ چائے کے BAGS خریدے ہمارے قریب ایک DEPARTMENTAL سٹور ہے وہاں سے میں علی الصبح سودا لاتا ہوں وہاں ایک متدین نوجوان یہی کوئی تیس پینتیس برس کے پیٹے میں ہوں گے بیٹھے ہوئے تھے میں پہلے ان کو مالک سمجھتا تھا۔ لیکن آج انھوں نے بتایا کہ وہ ہندوستان کے علاقہ حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں اور حج کے لیے آئے ہوئے ہیں ان سے سیاست پر باتیں ہونے لگیں۔ وہ ایوب کے سخت مداح تھے اور بھٹو کے مخالف۔ پاکستان کے زبردست دعاگو۔ پھر ان سے تلنگانہ اور آندھرا کے جھگڑے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ TEA BAGS سو کی تعداد والا ڈبہ پانچ ریال میں خریدا اسی طرح STAINLESS STEEL کے جلیٹ کے پانچ بلیڈ اڑھائی ریال میں خریدے۔ یعنی صبح صبح آٹھ ریال کی خریداری کی۔ گھر آیا ناشتہ تیار تھا۔ عائشہ نے اتنی دیر میں دلیہ بنا رکھا تھا اور اس کے ساتھ دال اور کلیجہ بھی کھایا اور چائے پی اس کے بعد میں نے برتن مانجھے، منہ ہاتھ دھویا اور شیو

بنائی۔ عائشہ نے صفائی کی اور تیار ہو کر باہر نکلے۔ اب مدینہ جانے کے لیے ٹیکسی کا انتظام ہمارے سر پر سوار ہے چنانچہ خیال کیا کہ ملک افضل جو مکی مرزوقی کا ایجنٹ ہے اس کے ہاں چلیں اور اس سے ٹیکسی سٹینڈ وغیرہ کا پتہ کریں۔ اس سے آپا سعیدہ اور عبدالرحیم کا بھی پتہ چل سکے گا۔ ہم جا رہے تھے کہ راستے میں غالباً افغانی یا ایرانی حاجی اپنا گیس کا چولہا ترم کے پاس ایک عربی دری فروش کے ہاتھ فروخت کر رہے تھے ہم بھی رک گئے اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں بیس ریال کہا وہ تیار ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے بیس ریال میں وہ چولہا خرید لیا۔ دراصل یہ چولہا ہم بہت دنوں سے خریدنے کی کر رہے تھے اور کل رات ہی ہم نے ایسا چولہا ۵۵ ریال کا دیکھا تھا۔ یہ حاجی واپس جا رہے تھے ان کے ملک میں گیس نہیں ہو گی اس لیے ان کے لیے بے کار تھا ان کو بیس ریال مل گئے ان کے لیے یہ غنیمت تھے ہم کو یہ بہت سستا مل گیا۔ یہ چولہا لے کر ہم مرزوقی کے ہاں پہنچے تو آگے ملک افضل کو حاجیوں نے گھیرا ہوا تھا اور وہ ہر حاجی کے الٹ پلٹ مطالبے کو سنتا اور اس کی تشفی کرنے اور ٹالنے میں مصروف تھا۔ بالآخر وہ کچھ دیر کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوا تو لپٹ گیا اور حاجیوں سے چھٹکارا کر کے ہمیں آپا سعیدہ کے کمرے میں لے گیا۔ آپا سعیدہ اور عبدالرحیم ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اور وہاں کافی دیر گپ ہوتی رہی۔ پھر افضل ہمیں اپنے ہاں ظہر کی نماز کے بعد کھانے کے لیے لے گیا۔ بہت دنوں کے بعد گھر کا کھانا کھایا ہے قیمہ اور مرچیں تھیں اور مچھلی کے ڈلیوں کا سالن تھا غرضیکہ بہت ہی سیر ہو کر کھایا۔ اور ملک افضل نے اپنے پیشے سے متعلق اور حاجیوں کی نفسیات کے بارے میں جو باتیں بتائیں اس نے ایک سماں باندھ دیا۔ وہ چودہ برس سے اس پیشے سے متعلق ہے اور تیرہ برس سے متواتر حج کے لیے آ رہا ہے اور تین تین چار چار مہینے رہتا ہے اس سال اس نے دو ہزار حاجی صرف پاکستان سے اپنے معلم کے لیے بک کیے ہیں اور اس نے کم از کم چالیس پچاس ہزار روپے کمائے ہیں وہ عربوں کی خوبیوں اور کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہے اسے پاکستانی حاجیوں کی نفسیات کا بھی پورا پورا علم ہی نہیں بلکہ جس حاضر دستی سے وہ بیان کرتا ہے وہ بذات خود ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس میں ایک زبردست منجھے ہوئے سیلزمین کی پوری خوبیاں موجود ہیں۔عصر کے بعد تک اس کی باتیں سنتا رہا اور اس سے نہ صرف کہ میرے علم میں کافی اضافہ ہوا بلکہ بہت حد تک محظوظ ہوا۔ یہ باتیں پھر کبھی قلم بند کروں گا۔

عصر کے بعد وہاں سے اٹھے۔ آپا سعیدہ کو اس کے فلیٹ چھوڑا اور ہم چولہا اٹھا کر گھر آئے۔ آکر اسی گیس کے چولہے پر ہم نے چائے تیار کی۔ چائے پی کر وضو کیا اور کپڑے بدل کر ہم حرم میں شام کی نماز کے لیے آگئے۔ اس وقت عشاء کی نماز ہونے والی ہے۔اب مدینے جانے کا مسئلہ بھی قدرے آسان ہو گیا ہے اس لیے کہ عبدالرحیم اور آپا سعیدہ بھی ہمراہ ہوں گے اور ہم انشاءاللہ ۳۱ر جنوری کو علی الصبح یہاں سے بذریعہ ٹیکسی چل دیں گے۔

۲۸ر جنوری

آج اتوار ہے حرم میں بیٹھا ہوں۔فجر کی نماز ادا کر چکا ہوں۔تہجد کی اذان پر اٹھ بیٹھا اور گیس والا چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھ دیا اور خود وضو کے لیے چلا گیا کہ اتنے میں پانی ابلنے چائے بنائی اور عائشہ کو اٹھایا رات سوتے وقت اس کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا اور بہت مشکل سے نیند آئی تھی خیر اس وقت قدرے بہتر تھی۔تہجد کے بعد نوافل گھر پر ہی پڑھی اور چائے پی۔اس کے بعد حرم میں آگئے۔یہاں آکر فجر کی اذان کے انتظار کے دوران میں نے بلال کو خط لکھا۔آج کافی دنوں کے بعد حرم میں صبح کو آیا ہوں تین چار دن سے ناغہ ہو رہا تھا۔یعنی صبح کو حرم میں نہیں آیا جاتا تھا۔دراصل حج کے بعد سے میری کیفیت مختلف ہونی شروع ہو گئی۔عرفات سے روانگی سے کیفیت مختلف تھی مجھ شدید رقت طاری تھی لیکن جیسے ہی وہاں سے نکلا ہوں تو یہ کیفیت مختلف تھی اس کے بعد سے اب تک کیفیت میں ایک گونہ لاتعلقی، بوریت، عبادت سے گریز وغیرہ کی حالت ہے۔ لیکن پہلے ایک دو دن سے

آہستہ آہستہ طبیعت پھر مائل ہو رہی ہے کہتے ہیں مدینہ پہنچ کر انسان پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ صدیوں سے جس شہر کو رحمتوں کے شہر کا لقب دیا گیا ہو۔ جو دیار حبیب ہو جہاں حبیب کا مدفن ہو اس شہر کے بارے میں انسان کی کیفیت کا مختلف ہونا چنداں عجب نہیں اور پھر جب اس کی پشت پر چودہ سو برس کا پیہم پروپیگنڈہ موجود ہو تو کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہوتا ہے

دراصل بات بہ تقریب حج کی اور یہ ہوتی ہے یہی تو ہوتی ہے۔ BRAIN WASHING کیا ہوتی ہے

بات چھوٹی چھوٹی ہر میں سلسلے اس ہے کوشش ترین اعلیٰ کی BRAIN WASHING

ایک کیفیت کا موجب بنتی ہے۔ اب حرم شریف ہی کی وسعت، اس کی کشادگی۔ اس کی عظمت، اس کی خوب صورتی اس کی سنگ تراشی، اس کی مینا کاری، ہر بات ایک کیفیت پیدا کرتی ہے اس وسیع اور کشادہ اور بلند و بالا عمارت کے درمیان ایک چار دیواری جس کو سیاہ غلاف سے ڈھانپا گیا ہے اور اس کے اُوپر کلمہ طیبہ سبز حروف سے کھدا ہوا ہے۔ یہ ایک ایک بات کیفیت پیدا کرتی ہے اور پھر جب لاکھوں انسان اس چار دیواری کو چمٹ چمٹ کر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ دعائیں کرتے ہیں تلبیوں اور محرومیوں کے تذکرے کرتے ہیں تو کون ہے جو متاثر نہ ہو۔ جب لاکھوں کروڑوں انسان گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے ہوں تو ہاتھ خود بخود اٹھ جاتے ہیں۔ آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور گریہ وزاری اور گڑگڑاہٹ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میکدہ ہے جس میں تمام پیاس بجھا رہے ہیں۔ جام پہ جام لنڈھا رہے ہیں۔ میرے ہاتھ کیوں خالی رہیں۔ میرے لب کیوں تشنہ رہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کعبۃ اللہ، حرم، صفا، مروہ یہ تمام عمارتیں ایک بامعنی عمارتیں نظر آنے لگتی ہیں لاتعداد آنسو پکارنے لگتے ہیں اور انسان REGIMENT ہوتا چلا جاتا ہے

وقت اس انسان کہاں ہے۔ ہیں مقدر کے اس ہونا REGIMENT

کے تجربے برس ہا ہزار نے اس جب تھا۔ ہوا نہیں REGIMENT

بعد یہ اپنے اُوپر پابندی لگائی کہ وہ ماں، بیٹی، بہن ان رشتوں سے جنسی تعلقات استوار نہیں کرے گا۔ کیا آج کوئی معاشرہ جو ان رشتوں کے ساتھ جنسی تعلقات کی اجازت

دیتا ہو ۔ جب سوویت روس میں انقلاب آیا تو سرمایہ داری نظام کے مبلغوں نے لتنا پراپیگنڈہ کیا کہ وہاں خاندانی زندگی ختم ہو گئی ہے ۔ ماں اور بہن کی تمیز ختم کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ تمیز ہزار ہا برس کے تجربے اور ہزار ہا برس کی REGIMENTATION کے بعد پیدا ہوتی ہے اس کو کیسے ختم کیا جا سکتا تھا۔

۲۹ جنوری

پیر کا دن ہے تہجد کے نوافل ادا کر کے اور چائے پی کر یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں پورے چوبیس گھنٹوں کے بعد روزنامچہ کھولا ہے۔ کل تمام دن نہ فرصت ملی اور نہ موقع ملا کل فجر کی نماز کے بعد وہیں حرم میں بیٹھ کر بلال کو تفصیلی خط لکھا۔ اس کے بعد گھر آئے۔ راستے سے کلیجہ لے آئے اور ناشتہ کیا اور ناشتے کے بعد کچھ دیر گپ کرتے رہے اس کے بعد صفائی کی۔ برتن مانجھے۔ عائشہ احرام کی چادروں کے دھونے کا اہتمام کرنے لگی۔ کیونکہ عمرہ ایک اور کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور میں بلال کو خط پوسٹ کرنے کے لیے گھر سے نکلا۔ نیچے گیا تو ہمارے مالکِ مکان کی دکان کے تھڑے پر ہمارا معلم عبداللہ عطاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے علیک سلیک ہوئی اور میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اس نے مجھے کہا کہ تم اپنے متعلق بتاؤ تو سہی کہ جماعت اسلامی والے تمہارے پیچھے آخر اتنے کیوں پڑے ہوتے ہیں اور اس کے بعد عبداللہ نے مجھے جماعت اسلامی کے لوگوں جن میں خلیل حامدی وغیرہ سبھی شامل ہیں کی میرے متعلق کارستانیاں تفصیل سے سنائیں۔ ان باتوں نے مجھے خاصا پریشان کیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ "دیندار" اور اسلام کے شیدائی یہاں آکر بھی سیاست میں ملوث ہیں۔ مجھے سخت کوفت ہوئی اور میں نے جا کر بلال کو خط پوسٹ کیا اور ڈاک خانے سے نکل کر میں سیدھا حرم میں گیا اور وہاں بیٹھ کر میں نے تین چار صفحات انگریزی میں OUTLOOK کے لیے گھسیٹ ڈالے وہاں یہ لکھ کر قدرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا لیکن وحشت سر پر اسی طرح سوار رہی

خیر گھر آیا اور راستے سے کلیجہ خرید لایا۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز پڑھ کے سو گئے اس کے بعد عصر کی نماز سے پہلے ہی حرم میں چلے گئے اور وہاں بیٹھ کر میں نے مولانا مودودی کے نام ایک خط لکھا اس میں پورے واقعات درج کیے ہیں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ تفصیلی خط مولانا مولانا مودودی کو بھیج دوں اور اس کی نقل اشاعت کے لیے بھجوا دوں اور اس پر پوری مہم چلا دوں ورنہ یہ سعودی عرب کی حکومت کے ذریعے پورے حج کی تقریبات کو آہستہ آہستہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے بارے میں روزانہ یہاں جو افواہیں گشت کرنے لگتی ہیں ان کی پشت پر بھی اسی جماعت اسلامی کے ان گماشتوں کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے ان کی بھٹو دشمنی انھیں کسی حد تک بھی لے جا سکتی ہے۔ پتہ نہیں میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں کہ نہیں کہ مجھے جماعت اسلامی سے شدید اختلافات کے باوجود ہمیشہ اس جماعت کے لوگوں سے ایک گونہ حسن ظن رہا لیکن ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات مثلاً قرآن کا جلانا، انفرادی صحافیوں کو ملازمتوں سے نکلوانے کی کوشش اور پھر سب سے آخر میں جب مارشل لاء کے دوران مجھ پر بنگلہ دیش کے حق میں اور فوج کشی کے خلاف تقریر کرنے پر مقدمہ چلا تو جماعت اسلامی کے کارکن اور ان کے حامی طلباء نے ڈٹ کر پولیس کی طرف سے شہادت دی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ نہیں، یہ جماعت تو بہت پست قسم کی جماعت ہے اور مولانا مودودی نے اسلام کے نام پر فاشسٹ گرگوں کو جنم دیا ہے جو جماعت اپنے سیاسی مقاصد کے لیے قرآن کو جلانے کا جعلی واقعہ بنانے سے دریغ نہیں کرتی وہ اپنے سیاسی مخالفوں پر جھوٹے مقدمات بنانے یا ان کو پھنسانے سے کیا گریز کرے گی اور اب تو اس جماعت کے کارکنوں کا ذکر ہی فضول ہے اس لیے کہ جس جماعت نے اللہ کے نام پر قاتل تخلیق کیے ہوں جس جماعت کے کارکنوں کے ہاتھوں پر ہزاروں مشرقی پاکستانیوں کا خون ہو ان سے کسی قسم کی شرافت یا اصول پرستی کی توقع عبث ہے۔

ایک خط جو حوالۂ ڈاک نہ کیا گیا

ابھی ابھی میں نے حرم شریف میں بیٹھ کر ایک خط مولانا مودودی کے نام لکھا ہے! مولانا سے ویسے میرے تعلقات اور نیازمندی قیام پاکستان سے پہلے کی ہے، جب مولانا پٹھان کوٹ میں تھے تو جب بھی لاہور آتے تو خواجہ عبدالوحید ان کے لئے کوئی نہ کوئی تقریب ترتیب دیتے اور دوستوں کے ہاں دعوتیں ہوتیں تو میں بھی ان میں شریک ہوتا، پاکستان بنا اور جماعت اسلامی نے کھل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو تمام اختلافات کے باوجود کمیونسٹ پارٹی اور جماعت اسلامی نے شہری آزادیوں کے لئے مہم چلائی اور جلسے منعقد کرنے کا اہتمام کیا تو میں ان جلسوں میں کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کے طور پر شریک ہوتا رہا اور مولانا مودودی خود جماعتِ اسلامی کے امیر کے طور پر جلسوں سے خطاب کرتے رہے پھر صحافت کے میدان میں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن ان تمام حالتوں میں مولانا کا احترام باقی رہا اور جب بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو نیازمندی کے ساتھ ہی ان سے ملا، اس لئے کہ سیاست میں شرافت اور احترام بہرحال ایک لازمی اور لابدی صفت ہونی چاہیئے اور اس کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیئے، چنانچہ میرے یہی جذبات ہمیشہ رہے ہیں اور انہی کے تحت میں نے مولانا سے ہمیشہ نیازمندی کا اظہار کیا چنانچہ جب وہ بیمار ہو کر لندن آئے تو ان دنوں میں بھی لندن میں تھا اور بدقسمتی سے میں خود بھی بیمار تھا اور لندن کے ایک ہسپتال میں تھا وہیں سے میں نے مولانا کو خط لکھا اور ان کی عیادت نہ کر سکنے کے لئے معذرت چاہی اور انھوں نے مہربانی سے جواب سے نوازا اس لئے جب عبداللہ عطاس سے مجھے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں نے مولانا مودودی کے نام ایک خط لکھا لیکن جب یہ خط میں نے عائشہ کو سنایا تو اس نے حوالۂ ڈاک کرنے سے منع کر دیا، اس نے دلیل یہ دی کہ یہ خط اگر سعودی حکومت کے محکمہ سنسر کے ہتھے چڑھ گیا تو کہیں اور مصیبت نہ کھڑی ہو اور ویسے بھی اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بات نے مجھے پریشان بہت کیا چنانچہ میں نے HOJEND-Politices کے عنوان سے انگریزی میں ایک خط

کے لئے ایک مضمون بھی رقم کیا لیکن وہ بھی میں نے نہ بھیجا۔

الموافق ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء

مکہ معظمہ حرم شریف - قبلہ سید مودودی صاحب،

سلام مسنون! میں یہ سطور آپ کی خدمت میں بصد ادب روانہ کر رہا ہوں، امید ہے آپ ان معروضات پر غور کریں گے۔ میرے سیاسی عقائد کچھ ہوں اور ان سے آپ کو کتنا بھی اختلاف ہو آپکو یا آپکے کسی حامی کو اصولاً اور اخلاقاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ میرے اسلام پر شک کرے یا میرے فریضہ حج پر شک کرے یا پھر اپنے اثر و رسوخ سے سعودی حکومت کے عمال میں میرے خلاف بدظنی پھیلا کر مجھے اس حکومت کے غیظ و غضب کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے

یہ تمہیدی جملے میں نے پہلے عرض کر دیئے ہیں اصل داستان کی طرف آتا ہوں طوالت کلام کے لئے میں معافی کا طالب ہوں، لیکن میں بہر حال اپنی پوری بات آپ تک پہنچانا ضرور چاہتا ہوں۔

میں اور میری بیوی ۲۸ دسمبر کو بذریعہ طیارہ یہاں پہنچے تھے، آتی دفعہ میں جناب احسان الٰہی ظہیر سے عقیل عطاس معلم کے نام تین چار جملوں پر مشتمل ایک تعارفی خط لے آیا تھا۔ چنانچہ یہاں پہنچا تو عقیل عطاس کے صاحب زادے عبداللہ جو اس فرم کا اب کاروبار چلاتے ہیں کو میں نے یہ خط دے دیا۔ اس کے بعد ایک کمرہ لے کر میں اور میری بیوی یہاں مقیم ہو گئے۔ معلم سے اس کے بعد ہمارا رابطہ شاذ ہی ہوتا تھا، ہم میاں بیوی زیادہ وقت حرم میں گذارتے اور جس فریضہ کے لئے آئے تھے اس کی ادائیگی میں مصروف رہتے، اسی دوران حج کی تقریبات جب شروع ہوئیں تو منیٰ میں میاں شفیع سے ملاقات ہو گئی، مجھے ان کی آمد کی اطلاع نہ تھی وہ کہنے لگے کہ انہیں اقبال سہیل کے واسطے سے میری آمد کا علم ہو گیا تھا، خیر بات آئی گئی ہو گئی کہنے لگے کہ میں تمہیں تلاش کر رہا تھا، اقبال سہیل تم سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ میں بھی ان سے ملنے کا خواہش مند تھا چنانچہ اسی وقت عشاء کے بعد ہم اقبال سہیل کے ہاں گئے جہاں دو تین گھنٹے گپ ہوتی رہی، جاتی دفعہ میں نے اقبال سہیل کے متعلق میاں شفیع سے تفصیلات معلوم کیں تو انہوں نے ان کے پورے خاندان اور مسلک کا ذکر کیا، میں نے پوچھا کہ روٹی روزگار کا اہتمام کیسے ہے تو میاں شفیع نے کہا کہ وہ سعودی حکومت کا کام کرتا ہے لیکن وہ اس بات کا اظہار نہیں چاہتا اس لئے تم اس کا ذکر نہ کرنا۔

اقبال سہیل کے ہاں کافی دیر بیٹھے رہے، واپسی پر میاں شفیع مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم احسان الٰہی ظہیر کا

خط لے کر آئے تھے، میں نے کہا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے تم تو پاکستان سے مجھ سے پہلے آئے ہوئے ہو، کہنے لگے کہ اقبال سہیل نے بتایا تھا۔ اس کو تمہارے معلم نے بتایا ہوگا اس لئے کہ اس کا جماعت اسلامی سے تعلق ہے، میں نے کہا کہ اچھا۔ اس وقت تک مجھے اپنے معلم کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، نہ ہی اس کی سیاسی وابستگی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ سچ یہ ہے کہ یہ باتیں میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں اس لئے کہ میں تو یہاں بالکل دوسرے مقصد اور دوسری کیفیت لے کر آیا تھا بہرحال مجھے اس امر کا دکھ ہوا۔ اس بات کو بھی کچھ دن گذر گئے، ایک دن عشاء کے بعد میں ڈاک دیکھنے کے لئے گیا تو عبداللہ خود بخود کہنے لگا کہ احسان الٰہی ظہیر کا جو خط تم لائے تھے وہ یہاں پڑا ہوا تھا وہ جماعت اسلامی والے روزانہ دیکھتے تھے اب وہ اس کو اٹھا لے گئے ہیں کیونکہ میری دراز میں نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

آج صبح میں اپنے کمرے سے نکلا تو عبداللہ باہر دکاندار کے پاس بیٹھا تھا، وہ کہنے لگا کہ تم اپنے متعلق تفصیلات تو بتاؤ کہ آخر تم کون ہو کہ جماعت اسلامی کے لوگ تمہارے متعلق اتنے پریشان کیوں ہیں اور روزانہ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ اسکو کیوں ٹھہرایا ہے یہ تو صحیح عقائد کا مسلمان نہیں، یہ کمیونسٹ ہے۔ پہلے احسان الٰہی ظہیر کا خط روزانہ دیکھتے رہے پھر ایک دن کہنے لگے کہ یہ خط نہیں چاہیئے۔ کبھی اس خط پر شک کیا جاتا، پھر اس کے بعد سعودی عرب کی حکومت کے اہل کاروں نے ٹیلی فون کرنے شروع کئے، ان کے عمال آئے اور تمہارے پاسپورٹ کا مطالبہ کیا اس کے بعد سعودی حکومت کی خفیہ پولیس دو دن تک تمہاری نگرانی کرتی رہی۔

یہ تمام باتیں عبداللہ عطاس نے مجھے بتائی ہیں، وہ آپ کا بہت معتقد ہے ویسے وہ خلیل حامدی وغیرہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا اور کہہ رہا تھا کہ یہ تو ہماری حکومت کے وظیفہ خور ہیں اور پیشہ ور ہیں لیکن مودودی مجاہد ہے اور عالم ہے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ یہ فاشزم ہے یا نہیں کیا آئندہ سے حج کے لئے آپ کے لوگوں سے اجازت لے کر آنا ہوگا اور ان سے سکریننگ کرانی ہوگی اور کیا اب یہ آپ کے لوگ سعودی عرب کی حکومت کی گستاپو کے فرائض انجام دینے پر مصر ہیں، مولانا سیاست کے میدان میں جو "دشمنیاں" ہوتی ہیں وہ اصولی طور پر تو دشمنی کے زمرے میں نہیں آتیں بلکہ اختلافات کے زمرے میں آتی ہیں لیکن آپ کی جماعت

کے لوگوں نے ان اختلافات کو دشمنیوں میں تبدیل کر دیا ہے، یہی دشمنی ان کو میرے خلاف مارشل لاء کے مقدمہ میں پولیس کے گواہوں کے کٹہرے میں لے گئی، کیا یہی سیاسی تربیت ہے ان لوگوں کی، ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں، ان اصولوں سے انحراف خواہ اشتراکی کرے یا جماعت اسلامی والا مورد الزام ٹھہرے گا

مولانا میں پھر طوالتِ کلام کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دوں، اس لئے کہ تمام اختلافات کے باوجود آپ کے علم اور اصول پرستی پر مجھے اب بھی اعتقاد ہے اسی اعتقاد کی بناء پر یہ سطور میں نے لکھنے کی جرأت کی ہے۔

آپ کا تابعدار

ملک عبداللہ

عصر کی نماز ہم نے حرم میں ادا کی، اس کے بعد آپا سعیدہ کی طرف گئے وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ وہاں سے نکلے تو ملک افضل کی طرف گئے تو وہاں بھی تالا اس کے بعد ہم WINDOW SHOPPING کرتے رہے اور چائے پی، زیورات دیکھے پھر مغرب کی نماز کے لئے حرم چلے گئے، وہاں سے نکلے تو آپا سعیدہ اور عبدالرحیم کے ہاں گئے وہ مل گئے گپ ہوتی رہی، عشاء کی نماز کے بعد ملک افضل اپنے خاندان اور ہم سب کو یہاں کے ہوٹلوں کی سیر کرانے اور کھانا کھلانے لے گیا، یہ بقر ہوٹل دراصل ہمارے پرانے زمانے کی سرائے کی نشانیاں ہیں، یہ مکے سے دس بارہ میل کے فاصلے پر لب سڑک بڑے بڑے چائے خانے ہیں جہاں چارپائیاں جو خاصی اونچی ہوتی ہیں اور ایک طرف لکڑی کی ٹیک بھی ہوتی ہے پڑی رہتی ہیں، یہ اڈے دراصل بدوؤں کے لئے کسی زمانے میں وجود میں آتے ہوں گے کہ وہ اپنے ریوڑ لے کر گذریں تو یہاں قیام کر لیں، یہاں ان کو کھانا ملتا ہے اور رات کے قیام کیلئے، گدا، رضائی اور تکیہ بھی مہیا کر دیا جاتا ہے۔

یہاں کھلی فضا، ٹھنڈی ہوا، کشادہ سڑکیں بالکل عجب سماں تھا، ٹیلی ویژن لگا ہوا تھا اور ٹیلی ویژن پر موسیقی کا پروگرام بھی تھا اور امریکی سٹنٹ فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں، وہاں سے کافی رات گئے ہم واپس آئے اب فجر کی نماز ہو چکی ہے، ہم نے گھر پر ہی جماعت کے ساتھ ادا کی ہے، اب تھوڑا سا پھر سونے کا ارادہ ہے۔

آج ہم نے عمرہ کیا، احرام باندھ کر بس میں بیٹھ کر مکے سے نو دس میل کے فاصلے پر ایک مسجد میں جا کر نوافل ادا کئے اور وہاں سے حرم میں آتے۔ آج پھر عمرے کے اس پورے عمل کے دوران مجھ پر شدید رقت اور گریہ و زاری کی کیفیت طاری ہوئی اور میں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کی، آج بہت رویا ہوں، پچھلے ایک ہفتے سے ہوتے ہوتے مجھ پر رقت اور گریہ و زاری کی کیفیت عود کر رہی تھی اور جو درمیان میں طبیعت عبادت سے اچاٹ ہوئی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہے، معلوم نہیں یہ کیفیت کیوں عود کر رہی ہے۔ شاید مدینے جانے کے دن جوں جوں قریب آ رہے ہیں یہ کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

تقریباً تین گھنٹے اس طواف اور صفا مروہ کے چکروں میں لگ گئے، عائشہ تو بہت تھک گئی چنانچہ ہم باہر نکلے اور ہم نے احرام میں ہی تصویر اتروائی، یہاں کی کوئی نشانی تو باقی رہنی چاہیئے، حرم شریف کے دروازے پر ہی کیمرے والے کھڑے ہوتے ہیں جو فوراً ہی تصویر اتار کر اور تیار کر کے دے دیتے ہیں۔ ہم نے رنگ دار تصویر کے تین ریال دیئے۔ وہاں سے ہم نے پھل خریدا اور گھر جا کر پھل کھا کے سو رہے۔ ظہر کے وقت اٹھے۔ چائے بنائی، نماز ادا کی اور نکل کے معلم کی طرف گئے اور ڈاک دیکھی، معلم تو تھا ہی نہیں، اس کے بعد آپا سعیدہ کی طرف گئے وہاں عبدالرحیم نے خوب خاطر تواضع کی، رات آپا سعیدہ کو درد کا دورہ پڑ گیا وہاں سے اٹھ کر ہم حرم میں آئے جہاں عصر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد باہر نکل رہے تھے کہ حرم کے اندر چار پانچ پنجابی آپس میں گپ کر رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھتے جاتے اور مسکراتے جاتے، یہاں پر بھی مجھے دیکھ کر بہت سے لوگوں کو بھٹو کا مغالطہ ہوتا رہا ہے۔ اس لئے میں نے یہی سمجھا لیکن میں نے اشتیاقاً ان سے پوچھا کہو کیا بات ہے، کہنے لگے آپ جدہ سے ٹکٹ لے آئے تھے، میں نے کہا ہاں، وہ بھی میرے جہاز جو کراچی سے ہمیں لایا تھا کے ہمسفر تھے وہ پوچھنے لگے کہ مدینے کب جا رہے ہیں، میں نے کہا کہ ۳۱ جنوری کی صبح کو وہ کہنے لگے کہ وہ تو رات کو جا رہے ہیں، کہنے لگے کہ پولیس والے دو گھنٹے بھی پہلے نہیں گزرنے دیتے۔ اس لئے آپ معلم سے پتہ کر لیں، اس سے پہلے عبدالرحیم ہمیں بتا چکا تھا کہ وہ بذریعہ طیارہ مدینے جا رہا ہے اور ہم نے حساب لگایا تھا تو کل تیس یا چالیس ریال کا فرق پڑتا تھا۔ اور ہم نے دردسری کی وجہ سے ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن اب جب یہ سنا کہ ۳۱ جنوری کی صبح کو نہیں جا سکتے تو بہت پریشانی ہوئی کیونکہ چالیس نمازوں کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر ایک بھی نماز چھوٹ جائے تو طبیعت پر بوجھ رہے گا۔ اس لئے ہم نے طے

کیا کہ معلم سے چل کر بات کرتے ہیں، اس کے پاس گئے، اس نے کہا کہ اگر ہوائی جہاز کی ٹکٹیں ملتی ہیں تو ضرور لے لو اور اس نے تنازل کی رقم اسی وقت دے دی چنانچہ ہم سعودی عرب ایرلائنز کے دفتر گئے اور ۳۱ کو صبح نو بجے کی دو نشستیں بک کروالیں لیکن انہوں نے کہا کہ ۳۰ جنوری کو جدہ پہنچنا ضروری ہوگا چنانچہ یہ نشستیں کر کے ہم مغرب کی نماز کے لئے حرم پہنچے تو وہی ہمسفر ملے اور ان کو پورا قصہ سنایا تو وہ کہنے لگے کہ وہ بھی بذریعہ طیارہ کی کوشش کرتے ہیں اس کے بعد گھر آئے اور معلم کو بتایا تو اس نے بھی یہی کہا کہ صبح جلدی میں جدہ روانہ ہو جاؤ کہ اس کے کہ سعودی عرب ایرلائنز کا کوئی پتہ نہیں، سو اب یہی فیصلہ کیا کہ جدہ ۳۰ جنوری کو دوپہر سے پہلے ہی روانہ ہو جائیں، اس کے بعد گھر آتے، عائشہ نے عشاء کی نماز پڑھی، اس کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ اسی وقت افضل اور عبدالرحیم کو جا کر مل آئیں، چنانچہ ہم عشاء کے بعد ہمارے پاس جو خشک میوہ اور پاپڑ وغیرہ بچے ہوئے تھے وہ لے کر افضل کے ہاں گئے، وہ گھر پر مل گیا۔ اس نے بہت خاطر تواضع کی حالانکہ اس کی بیوی ساجدہ کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اور بخار کی حرارت تھی لیکن اس کے باوجود بہت اصرار کے ساتھ چائے پلائی اور صبح کے ناشتے کی دعوت دی، وہاں سے ہم اٹھ کر عبدالرحیم اور آپا سعیدہ کے ہاں گئے۔ ان کو بتایا۔ وہاں سے خاصی دیر کے بعد گھر لوٹے، معلم کے پاس گیا تو وہ اپنی دکان بڑھا چکا ہوا ہے۔

۳۰ جنوری کو تہجد کی اذان سے پانچ دس منٹ پہلے ہی میری نیند کھل گئی، رات نیند خوب آئی، اس لئے کہ سارے دن کی زبردست تھکان تھی لیکن عائشہ بیچاری نہ سو سکی، اس کے اعصاب پر وہی روانگی، سامان کا باندھنا، جدہ رات کا قیام، پھر مدینہ روانگی، یہ سب دردسری اس کو ستاتی رہی، ویسے ہم دونوں کو یہ دردسریاں ہمیشہ ستاتی ہیں اور پریشانی کا موجب بنتی ہیں لیکن رات مجھے سکون رہا اور میں اس دفعہ زیادہ TENSION کا شکار نہیں ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے ورنہ میں تو اس TENSION کے ہاتھوں ادھ موا ہو جایا کرتا ہوں، میں نے اٹھ کر گیس والا چولہا جلایا لیکن ابھی پانی گرم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی گیس ختم ہو گئی، ہم کل سے پریشان تھے کہ اس کی گیس کیسے نکالیں گے کیونکہ ہوائی جہاز پر تو گیس والا چولہا لے جانے نہیں دیتے، سو اللہ تعالیٰ نے خود بخود یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ دوسرا تیل والا چولہا جلایا اور چائے بنائی، اتنے میں تہجد کی اذان ہو گئی، میں نے اور عائشہ نے تہجد کے

نوافل ادا کئے، اس کے بعد میں حرم شریف میں فجر کی نماز کے لئے چلا گیا تاکہ وہ لوگ جو ہمسفر بننے کے خواہش مند تھے مجھے تلاش نہ کر رہے ہوں، وہ مسجد میں مل گئے اور کہنے لگے کہ سٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق ۹ بجے سعودی عرب ایئر لائنز والوں نے ٹکٹ کے لئے بلایا ہے اور وہ کہنے لگے کہ آپ بھی تکلیف کر کے وہاں آجائیں، اس کے بعد میں گھر آیا، سامان باندھا، نہایا، عائشہ نے وضو کیا اور ہم طواف وداع کے لئے چلے گئے، وہاں طواف کیا۔ آج صبح کی نماز سے ہی پھر مجھ پر رقت طاری ہے اور میں رو رو کر اللہ تعالیٰ سے بخشش اور گناہوں کی معافی کا طالب ہو رہا ہوں، طوافِ وداع کے دوران بھی یہی کیفیت تھی میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت مستقل ہے یا عارضی لیکن اس گریہ وزاری اور گڑگڑا کر بخشش چاہنے سے سکون ملتا ہے اور دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

حرم سے نکل کر ٹکٹ ہوٹل گئے، ابھی میرے ہمسفر نہیں آئے تھے دس منٹ کے بعد وہ بھی آگئے چنانچہ کاؤنٹر پر درخواست کی کہ ان کی فلائٹ بھی ۸۲۶ کر دی جائے، اب جو میں ٹکٹ دیکھتا ہوں تو میرے باہر کے CARD پر تو فلائٹ نمبر ۸۲۲ ہے اور اندر ۸۲۶ ہے۔ اب میں نے ان سے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے، خدا خدا کر کے وہ انھوں نے درستگی کی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت سے بچا لیا۔ وگرنہ وہاں جا کر پھنس جاتا۔ اس کے بعد ان سے ظہر کی نماز کے موقع پر ملنے اور اس کے بعد روانگی کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ کر کے میں اور عائشہ ملک افضل کی طرف گئے۔ اور وہاں دال پر اٹھے، دہی، شہد، کسٹرڈ اور چائے سے تواضع ہوئی۔ بہت اچھا ناشتہ تھا اور بہت اچھی گپ رہی، ان لوگوں نے بہت خاطر تواضع کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے، وہاں سے ہم گھر پہنچے اور عائشہ آرام کر رہی ہے اور میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، اس طرح سے اب تک روئیداد لکھ دی ہے لیکن یہ جو سفر اب شروع ہونے والا ہے اس میں معلوم نہیں فرصت کب ملے اور کب نہ ملے، بہر حال میں روئیداد کسی نہ کسی وقت قلم بند کرتا رہوں گا۔

اس وقت جدہ کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوں، شام کی نماز ادا کر کے ابھی فارغ ہوا ہوں، پورا کیفے ٹیریا مدینہ جانے والے مسافروں سے بھرا ہوا ہے اور ہر ایک طیارے کا منتظر ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ طیارہ کب آئے گا اور کب پرواز ہوگی۔ ایک دفعہ ہم کو بلا کر ہمارے بورڈنگ کارڈ آدھے پھاڑ کر، ہمارے ذاتی سامان کی تلاشی لے کر اور جسم کا پوری طرح معائنہ کر کے واپس کیا جا چکا ہے کہ پرواز منسوخ

ہو گئی ہے، آپ انتظار کریں۔ چنانچہ اب تمام لوگ پرواز کی راہ تک رہے ہیں، اس کیفے ٹیریا میں امریکی خاصی تعداد میں بیٹھے ہیں یہ سب دہران اور ریاض کی پرواز کے منتظر ہیں۔ ابھی یہ سطور لکھ رہا تھا کہ ریاض اور دہران کی پرواز کا اعلان ہو گیا اور غیر ملکیوں بالخصوص امریکیوں کی پوری کھیپ سامان بدست قطار میں کھڑی ہو گئی۔ سعودی عرب ملکی نوکر شاہی کے چہروں پر رعب اور سختی بہت شدید طور پر نمایاں ہے اور جب وہ چیکنگ کرتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھا ہی جائیں گے، کوئی مسکراہٹ کوئی نرمی نظر نہیں آتی، حالانکہ کسی ایئر لائنز کے اہلکاروں میں تو خاصی SALESMANSHIP ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں کی تلاشی بہت سخت ہوتی ہے اور یہ امریکیوں کا قطعاً لحاظ نہیں کرتے۔ ان کی گھڑیاں تک اتروا لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اسی طرح ان کی عورتوں کے پرس بھی خاصی سختی سے چھانتے ہیں، اور تو اور میری جیب میں ریال تھے تو وہ بھی آپ نے تنا دیئے اور وہ نکلوا کر چیک کئے یعنی ان میں کوئی ایسی میٹل نہ ہو جو جہاز کو تباہ کرنے کے لئے استعمال ہو سکے۔ غالباً HIJACKING کے خوف نے یہ سختی پیدا کی ہے —

۳۱، جنوری

اس وقت جدہ کے وقت کے مطابق صبح کے ساڑھے دس بجے ہیں یعنی پاکستان میں اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے اور حرم کے وقت کے مطابق ساڑھے چار بجے ہیں اور ہیں اور عائشہ مسجد نبوی میں رسول خدا کو درود و سلام بھیج رہے ہیں آنکھیں پرنم ہیں رقت طاری ہے اس جہان رنگ و بو کی سب سے عظیم شخصیت کے روضہ کے قریب بیٹھے ہیں اس عظیم شخصیت اور محسنِ انسانیت کی زندگی یہاں بکھری پڑی ہے۔ کہیں منبر ہے تو کہیں ستون ہیں تو کہیں ریاض الجنت ہے اور فدائیان کا ہجوم ہے کہ ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر اور روضہ اقدس کی جالی کی ایک ایک سیخ کو چومنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکے دینے سے بھی گریز نہیں کرتے اور حکومت کے متعین کردہ سپاہی ان فدائیان کو شرک شرک پکار کر باز

رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ہم نے ارشاد رسولؐ اور مسنون طریقے کے مطابق جہاں بھی نوافل پڑھنے اور سلام بھیجنا تھا وہ کرلیا ہے۔ اب مسلسل ایک ہفتہ نمازوں اور درود و سلام کا اہتمام کرنا ہے۔

مدینہ آنے سے پہلے جب مکہ میں ہوتے ہیں تو وہاں کی تکلیفوں کا ذکر ہوتا ہے اور حج کے دوران پیش آنے والے واقعات کی یاد ایک گونہ تکلیفوں اور مصائب کا دور یاد کرادیتی تھی تو تجربہ کار لوگ یہی کہا کرتے تھے کہ مدینے جاکر تمام تکلیفیں بھول جائیں گی۔ اس وقت میں ان لوگوں کی باتوں کو سنتا ضرور تھا لیکن یقین نہیں کرتا تھا اور تمام باتوں کو خوش عقیدگی پر محمول کرتا تھا۔ لیکن ہمارے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے واقعات درپیش ہیں کہ ہم کو پچھلے دنوں کی تمام پریشانیاں، تمام اضطراب اور تمام مصائب بھول گئے ہیں اور یہاں آکر آناً فاناً جو آرام خلاف توقع میسر آیا ہے اس نے یہ تمام پچھلی تکلیفوں کو دور کردیا ہے۔

کل جس وقت یہ سطور لکھنی بند کی تھیں اس وقت تو پریشانیاں، اضطراب بے بسی اور بے چارگی اپنے نکتہ عروج پر تھی اور ہم جدہ ایرپورٹ پر حیران و پریشان بیٹھے تھے کہ جدہ کے وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ بجے رات کو دوبارہ مدینے جانے والے طیارے کا اعلان ہوا اور ہم قطار بناکر قدرے دھکم پیل کرکے باہر نکلے بس میں بیٹھے تاکہ طیارے تک پہنچیں لیکن بس نے چکر کاٹنے شروع کردیے ہم پھر پریشان ہوگئے کہ اب پھر کہیں یہ پرواز منسوخ تو ہوگئی لیکن نہیں بالآخر خدا خدا کرکے ہم طیارے میں بیٹھ گئے یہ طیارہ بوئنگ تھا۔ ایرپورٹ کے اندر تو مدینے کے مسافروں کا بظاہر بڑا ہجوم نظر آتا تھا لیکن جب طیارہ روانہ ہوا تو وہ تقریب تقریب خالی تھا اور بمشکل پندرہ بیس مسافر تھے قریب قریب ۵۰ منٹ کے وقفہ کے بعد مدینہ پہنچنے کا اعلان ہوا اور ہم نے پھر اپنی پیٹیاں باندھنی شروع کردیں اور دیکھتے ہی دیکھتے طیارہ مدینے کے ہوائی اڈے پر اتر گیا ہم باہر نکلے اور ہوائی اڈے کے لاؤنج میں پہنچے تو سماں ہی کچھ اور تھا وہ تو ہوائی اڈے کا لاؤنج دور دور تک بھی نظر نہیں آتا تھا بلکہ تھرڈ کلاس کا پر ہجوم مسافر خانہ لگ رہا تھا جہاں مسافر مرد اور عورتیں اپنے سامان کا ڈھیر لگائے ان کے پاس گاڑی کے منتظر بیٹھے ہیں نہ کوئی بنچ نہ کوئی صوفہ۔ نہ کوئی کرسی، نہ آنے والے کے لاؤنج کا کوئی پتہ چلتا تھا اور نہ جانے والے کے لاؤنج کا ہم نے بھی بالآخر قدرے خالی ٹکڑا دیکھ کر اپنے ہاتھوں اور کندھوں کا سامان اتار کر وہاں رکھ دیا اور عائشہ کو ان کی رکھوالی کے لیے بٹھادیا اور خود اپنے سامان کے

انتظار میں دھکے کھانے لگے کہ کہاں سامان آتا ہے ۔ کیسے آتا ہے وغیرہ وغیرہ بالآخر ہم نے دیکھا کہ باہر ٹرالیوں پر سامان لدا ہوا آرہا ہے ۔ جان میں جان آئی ۔ اتنے میں ایک افسر نے عربی میں اعلان کیا کہ باہر جا کر ایک ایک کر کے اپنا سامان دیکھ لیں اور اتار کر لے آئیں خود وہ دروازے پر کھڑا ہوگیا اور LUGGAGE TICKETS وصول کرنے لگا ۔

ہم نے اپنا سامان ڈھونڈ کر ٹرالی سے اتارا اور بصد مشکل اس کو اتار کر پہلے افسر کے پاس لائے پھر وہاں سے یہ منوں بوجھ اٹھا کر عائشہ کے پاس لائے اور پھر وہاں سے باہر سڑک پر لا کر ڈھیر کیا اور ٹیکسی کا معاملہ طے کرنے لگے پندرہ ریال سے کم کسی ٹیکسی والے نے لینا قبول نہ کیا ۔ بالآخر پندرہ ریال پر ہی معاملہ طے ہوا ۔ لیکن ٹیکسی تین گز کے فاصلے پر کھڑی تھی اور وہ تین گز آگے آکر سامان لادنے کے لیے تیار نہ تھی ۔ کیونکہ پولیس نے منع کیا ہوا ہے ہم نے بہت منت کی اور یہ بھی کہا کہ ہم پولیس سے کہدیں گے لیکن ٹیکسی والا راضی نہ ہوا ۔ بالآخر ہم نے خود سامان اٹھا کر ٹیکسی پر لادا ۔ اس نے اس میں بہت کم ہاتھ بٹایا ، ان تمام تجربات اور اس تمام بوجھ اٹھانے کے عمل نے بالکل ادھموا کر دیا ۔ میں نے جہاز میں ہی سویٹر پہن لیا تھا کہ یہاں سردی ہوگی ، لیکن یہاں سردی بالکل نہیں تھی اور سامان اٹھاتے اٹھاتے پسینہ سے شرابور ہوگیا اور آخر کار جب ٹیکسی چلی اور ہوا لگی تو کچھ فرحت محسوس ہوئی ۔ ہم سیدھے حیدرالحیدری معلم کے ہاں پہنچے ۔ جیسے ہی ہم مسجد نبوی کے قرب و جوار میں پہنچے تو پورا شہر جاگتا دکھائی دینے لگا ہم جب حیدرالحیدری کے ہاں پہنچے تو وہ باہر ہی کھڑا تھا ۔ اس نے ہمارا استقبال کیا اور وہ ہمیں سامان سمیت ایک کمرے میں لے گیا ۔ تنگ و تاریک متعفن گلیاں گزر کر ہم ایک مکان میں داخل ہوئے اس کا ایک کمرہ اس نے ہمیں دکھایا اور میں تو پریشان ہوگیا ۔ عائشہ مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہوگئی لیکن ہمارے ساتھی اس سے معاملہ طے کرنے میں مصروف ہوگئے اور اس نے اڑھائی سو ریال طلب کیا میں نے افضل والا خط نکالا اور الیمانی ہوٹل کا پتہ معلوم کرنے لگا ، آخر میں اپنے ساتھیوں کو لے کر باہر نکلا اور ان کو میں نے صاف کہہ دیا کہ ہم ایسے کمروں میں گزر نہیں کر سکتے وہ کہنے لگے کہ رات کے کچھ گھنٹے ہی تو گزارنے ہیں لیکن میں نے کہا کہ عبادت کے لیے ضروری ہے کہ آرام سے رہا جائے اور صاف ستھری جگہ پر رہا جائے تاکہ سکون ملے آرام میسر ہو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عبادت بھی دل جمعی سے ہو سکے گی ۔ یہ باتیں کرتے ہوئے

ہم لوگوں سے پوچھتے جا رہے تھے کہ فندق الیمانی کہاں ہے کہ ایک فندق احد نظر آیا۔ اس کے اندر چلے گئے تاکہ الیمانی کا پتہ چلایا جائے۔ اس کے منیجر نے کہا کہ جگہ درکار ہے۔ وہ انگریزی جانتا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس نے دو کمرے دکھائے ایک میں چار چارپائیاں بمعہ فوم کے گدوں کے اور بستر کے لگی ہوئی تھیں درمیان میں میز کرسی، ایک غسل خانہ نہانے کا۔ غرضیکہ صاف ستھرا ماحول، فرج بھی تھا خیر ہم یہ کمرے دیکھ بہت خوش ہوئے۔ اس سے آکر بات کی اس نے کہا کہ فی یوم فی کس ۱۰ ریال۔ ہم نے کہا کہ چار بستروں والا کمرہ ۸ ریال فی کس فی یوم پر اگر وہ رضامند ہو تو ہم لے لیں گے وہ رضامند ہو گیا بشرطیکہ اس میں COOKING نہ ہو۔ میں نے کہا کہ ہم گیس کے چولہے پر صرف چائے تیار کریں گے۔ وہ رضامند ہو گیا۔ میں نے کہا میں اپنی بیگم کو دکھا لوں، وہاں سے نکلے اور الیمانی کو آخر ڈھونڈ نکالا۔ کے بعد دو تین اور ہوٹل دیکھے لیکن مہنگے اور کمتر چنانچہ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ یہی لے لیں۔ میں نے کہا کہ بیگم جب تک رضامند نہ ہو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد دو تین اور ہوٹل دیکھے لیکن مہنگے اور کمتر۔ خیر ہم واپس اسی کمرے میں پہنچے جہاں عائشہ کو چھوڑ کر گئے تھے عائشہ پریشان اور سہمی ہوئی ہماری منتظر تھی جب اس کو ہوٹل کا بتایا تو بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ مجھے جلدی سے جلدی یہاں سے لے چلو۔ خیر میں نے نور الحسن اور عائشہ سے ہاتھ اور کندھوں والا سامان اٹھایا۔ یوسف کو وہاں چھوڑا اور ہوٹل میں آئے اس نے ایک اور کمرہ دکھایا۔ لیکن وہ ہم نے ناپسند کیا اور جو کمرہ ہم پہلے دیکھ کر گئے تھے وہ جب عائشہ نے دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتما اٹھا اور وہ اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرنے لگی۔ اس کو وہاں بٹھا کر ہم پھر واپس گئے کہ بقایا سامان لائیں۔ چنانچہ سامان لاتے اور اس کو رکھتے ہوئے تقریباً بارہ بج گئے۔ عائشہ کہنے لگی کہ بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ آدھی رات کو ہم کچھ کھانے کے لیے نکلے تو تمام ہوٹل بند ہو گئے تھے اور ہم نے ایک بیکری سے ایک ریال میں پانچ نان خریدے اور آدھے ریال کا سبزیوں کا اچار خریدا۔ ہمارے پاس بھی آم کا اچار تھا۔ غرضیکہ اچار اور نان سے ہم نے بھوک مٹائی اور فرج کا ٹھنڈا پانی پیا بے حد لطف آیا اور اس کے بعد سو گئے تقریباً پینتیس دن کے بعد ہم کو چارپائی پر سونا نصیب ہوا۔ شکر ادا کیا۔ ہم سبھی بے حد مسرور اور مطمئن تھے۔ خیر ہم سوئے۔ مجھے کوئی زیادہ گہری نیند نہ آئی اس لیے اولاً بہت دیر ہو گئی تھی اور جلدی اٹھنے کا خوف مسلط تھا دوم

تھکان بہت زیادہ تھی وہ اتنی زیادہ تھی کہ اس کے تناؤ نے بھی نہیں سونے دیا۔ نورالحسن سب سے پہلے اٹھا۔ جب وہ اٹھا تو میری نیند بالکل ہی کھل گئی میں نے کوئی تہجد سے ایک گھنٹہ پہلے عائشہ کو اٹھایا اس نے کہا کہ ابھی سو جاؤ۔ آخر کار تہجد سے تقریباً پندرہ بیس منٹ پہلے عائشہ اٹھی اور میں بھی اٹھا اس وقت تک دونوں ہم سفر نہا دھو کر تیار ہو گئے تھے ہم نے بھی مسنون طریقے کے لیے غسل کیا، کپڑے بدلے اور اتنے میں تہجد کی اذان ہو گئی تو ہم ہوٹل سے نکلے۔ مسجد نبوی ہمارے ہوٹل سے بمشکل پانچ منٹ کے فاصلے پر ہوگی بلکہ اس سے بھی کم ہوگی جب ہم باب جبریل والی سڑک پر مڑے تو ہجوم سڑکوں پر جاتے نماز بچھا کر صف آرا تھا۔ خیر میں اور عائشہ باب جبریل تک پہنچے تو چوکیدار نے مجھے منع کر دیا۔ عائشہ اندر چلی گئی۔ میں نے واپس آکر سڑک کے کنارے جا نماز بچھالی اور پہلے تہجد کے نفل ادا کیے اس وقت مجھے رہ رہ کر نعتیں یاد آ رہی تھیں۔ جن میں مدینے کی گلیوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور آج میں بھی اسی گلی میں بیٹھا رسول خدا کو نم آلود آنکھوں اور رقت کے ساتھ درود و سلام بھیج رہا تھا۔ مجھ پر رقت طاری تھی اور عجیب و غریب کیفیت کا عالم تھا۔ یہ کیفیت پچھلے دو تین دن سے مسلسل مجھ پر طاری ہے اور میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں کر سکتا۔ نماز ادا کی وہ بھی اسی کیفیت میں اور پھر عائشہ کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اسے تو ہوٹل کا نام بھی معلوم نہیں۔ خیر میں باب جبریل والی سڑک پر اسی کا منتظر رہا۔ آخر وہ مل گئی۔ اس کے بعد ہم نے چائے پی اور آکر لیٹ گئے۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ آخر خدا خدا کر کے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم نے سو لیا اور نو بجے کے قریب ہم گھر سے مسجد نبوی کے لیے نکلے تاکہ روضۂ رسول پر حاضری دیں۔ اندر آنے سے پہلے ہم نے ایک پاکستانی ہوٹل میں پیٹ بھر کے ناشتہ کیا۔ یہ ناشتہ نان اور پائے، پوری اور حلوہ تھا اور اس کے بعد چائے پی۔ یہ ناشتہ کر کے ہم نے وضو کیا اور مسجد نبوی میں آگئے۔ ہم مسجد نبوی میں ساڑھے نو بجے آئے نوافل ادا کیے۔ سلام بھیجا اور اب یہاں منبر رسول کے قریب میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں مجھے یہاں بیٹھے اور لکھتے ہوئے تقریباً پونے دو گھنٹے ہو گئے ہیں عائشہ اٹھ کر چلی گئی ہے وہ عورتوں میں جا بیٹھی ہے۔ ظہر کی نماز میں اب تقریباً آدھ پون گھنٹہ رہ گیا ہے اچھا باقی جو بیتے گی لکھ دوں گا۔

یکم فروری

یہ فروری کی پہلی تاریخ ہے اور جدہ کے وقت کے مطابق صبح کے سوا آٹھ بجے ہیں اور اس وقت یہ سطور میں غسل خانے میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں سخت پریشان اور مضطرب ہوں عائشہ کی طبیعت سخت خراب ہوگئی ہے اس کے پیٹ میں شدید درد ہے تین اجابتیں بھی ہو چکی ہیں لیکن ابھی تک طبیعت بحال نہیں ہوئی میرے بھی پیٹ میں گڑبڑ ہے اور میں بھی تیسری بار اجابت کے لیے غسل خانے آیا ہوں تہجد تک بالکل ٹھیک تھے تہجد کی اذان سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہی ہم بیدار ہو گئے تھے اور اذان سے پہلے میں نے چائے بھی بنائی اور اپنے ہم سفر رفقاء کو بھی پلائی خود بھی پی اور عائشہ نے بھی پی - عائشہ مجھ سے پہلے ہی مسجد میں چلی گئی میں اس کے بعد نہایا اور اطمینان کے ساتھ مسجد گیا جس وقت مسجد میں پہنچا اور جگہ بھی مل گئی نوافل بھی پڑھ لیے تو اس کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد فجر کی اذان ہوئی - فجر کی نماز اطمینان سے پڑھ کے میں مسجد سے نکلا اور ناشتے کے لیے سامان خریدا پانچ نان خریدے، مکھن کا ڈبہ اور جام خرید کیے اور کمرے میں آیا تو عائشہ لیٹی ہوئی تھی - اور نورالحسن بھی کمرے میں ہی تھے انھوں نے بتایا کہ پیٹ میں درد ہے چنانچہ اس کے بعد کارمینا کی دو گولیاں دیں، کچھ افاقہ ہوا پھر چائے بھی بنا کر دی عائشہ نے ناشتہ نہیں کیا صرف نان کے دو چار نوالے اچار کے ساتھ لیے ہم تینوں یعنی نورالحسن، چودھری یوسف اور میں نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا اور چائے بنائی خیال تھا کہ آج مدینہ کے تمام مقدس مقامات کی سیر کریں گے لیکن عائشہ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا، عائشہ نے مجھے بتایا کہ اس تہجد کے نوافل اس سے پہلے وتر وغیرہ پڑھے اس کے بعد فجر کی اذان ہوئی تو اس کو پیٹ میں شدید درد محسوس ہوا، اس نے وہیں مسجد میں ساتھ والی خاتون کی تھرماس سے پینے کے لیے پانی لیا اور اس کے ساتھ اسپرو کھائی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا - اب یہ اتنی بے تاب تھی کہ نماز کے بغیر واپس آنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ امام نے جماعت کی تکبیر

پڑھنی شروع کردی چنانچہ اللہ نے نماز قضا نہیں ہونے دی اور نماز اس نے اسی درد کی حالت میں ادا کرلی۔ اس کے بعد گھر جلدی سے آنے کے لیے جوتی اٹھانے لگی تو جوتی غائب تھی بہت تلاش کیا لیکن اس کو نہ ملنا تھا نہ ملی اور یہ ننگے پاؤں بھاگم بھاگ اجابت کے لیے ہوٹل آئی آگے ہجوم تھا یہ سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچی اور اجابت کھل کر ہوئی اور تھوڑا سا افاقہ محسوس ہوا۔ لیکن اس کے بعد پھر شروع ہوگئی یہ دراصل ہم دونوں کے پیٹ میں گڑبڑ رات عشاء کے بعد پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہاں سے گوشت کھایا پر اس نے پیٹ کے پورے نظام کو درہم برہم کردیا ہے۔ اب توبہ کی ہے کہ پاکستانی ہوٹل کا کھانا نہیں کھائیں گے روکھا سوکھا کھالیں گے ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔

کل جو گزر گیا ہے وہ بہت ہی یادگار دن رہا ہے اس لیے کہ یہ پہلا دن تھا جب مسجد نبوی میں پانچوں نمازیں با جماعت ادا کیں۔ یہاں کی ایک ایک نماز کے لیے شکر ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ چالیس باجماعت نمازوں کے لیے ہی تو انسان اتنے جتن کرتا ہے کل شام کی نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے تو کہ میں جو ہمسائے تھے ان کو خط حوالہ ڈاک کرنا تھا۔ کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ پوری صورت حال سے ہمیں مطلع کرنا یہ خط پوسٹ کرنے کے لیے میں اور عائشہ جا رہے تھے کہ نورالحسن اور یوسف مل گئے، کہنے لگے کہ ہوٹل میں ایک اور کمرہ ان کے ساتھی اور اس کی بیوی کے لیے چاہیے اس کی بات چیت کروا دیجیے۔ چنانچہ یہاں آکر بات چیت کی اور عائشہ کو مسجد میں بھیج دیا ہوٹل سے پھر میں ڈاک خانہ گیا وہاں سے ٹکٹ لے کر خط حوالہ ڈاک کیا اور مسجد میں آگیا، جگہ مل گئی مغرب کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد ہوٹل آرہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ آگے مولانا عبیداللہ انور جا رہے ہیں میں نے ان کا کندھا تھپتھپایا، انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو لپٹ گئے اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اس لیے کہ میری بڑی دیرینہ خواہش تھی کہ مدینہ آؤں اور حافظ حبیب اللہ، مولانا عبیداللہ انور کے بڑے بھائی سے ملاقات کروں اور بچپن کی یادیں تازہ کریں لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ مجھے جب یہاں آنے کا موقع ملا تو وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے تھے اور میں یہاں آکر جگہ جگہ سے پوچھتا تھا کہ ان کی قبر کا پتہ چلے تو قبر پر جا کر کم از کم فاتحہ ہی کہہ لوں مجھ پہ شدید رقت طاری تھی

اور مولانا عبیداللہ انور بھی بہت متاثر اور مسرور تھے مجھے یہاں دیکھ کر وہ فوراً پلٹے اور مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئے وہاں ان کے معتقدین کا ہجوم تھا۔ مجھے بٹھایا ان سے ملوایا وہاں ایک بڑے متدین باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، میں نے جب مولانا عبیداللہ انور کو بتایا کہ جماعت اسلامی نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور انھوں نے جو حرکات کی ہیں تو یہ متدین بزرگ کچھ جماعت اسلامی کو DEFEND کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان کا بھی عقیل عطاس ہی معلم تھا اور وہاں پر میرے آنے کا چرچا بھی تھا لیکن یہ اب جو باتیں جماعت اسلامی سے منسوب کر رہے ہیں یہ کچھ الزام ہی معلوم ہوتا ہے، میں نے کہا کہ عبداللہ عطاس نے یہ باتیں بتائی ہیں اس پر بھی وہ نہ مانے پھر میں نے تفصیلاً ان کو جماعت کے کردار کے متعلق بتایا سعودی حکومت کے بارے میں بتایا اور اپنے تاثرات کے بارے میں بھی بتایا غرضیکہ وہاں عشاء تک مولانا کے پاس بیٹھا رہا اور مولانا باربار اپنے لوگوں کو میرے دادا مرحوم اور دادی مرحومہ کے بارے میں اور ان کے احسانات کے بارے میں بتاتے رہے اور میں روتے جارہا تھا کہ ایسے بھی نیک لوگ ہیں جو دوسری پشت تک احسانات کو یاد ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ بار بار اصرار سے مجھے کہہ رہے تھے کہ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو لے لیجیے۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ ان سے فقط دعا کے لیے کہتا رہا اتنے میں عشاء کی اذان ہوگئی ہم دونوں مسجد سے باہر سڑک پر ہی جانماز بچھا کر بیٹھ گئے اور نماز ادا کی اس کے بعد انھوں نے میرے لیے، میرے خاندان کے لیے اور روزنامہ آزاد کے دوبارہ اجراء کے لیے دعا کی اور کہا کہ آزاد کے سلسلے میں دوستوں اور دشمنوں نے جو وار تم پہ کیے ہیں وہ بھی ایک سازش تھی اور اس سازش میں ہمارے دوست دشمنوں سے کہیں زیادہ پیش پیش تھے اور کہنے لگے کہ اس کے باوجود اخبار نکلنا چاہیے میں نے کہا کہ دعا کیجیے انھوں نے پھر اخبار کے لیے دعا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئے اور الوداع کہتے وقت کہنے لگے کہ تم میرے بڑے بھائی کے دوست ہو میں تمھاری دعوت یہاں کرتا لیکن وقت بہت کم ہے اس لیے یہ حقیر سا تحفہ قبول کرو۔ اس کا انکار نہ کرنا اور یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے نوٹوں کی ایک دتھی میرے ہاتھ میں تھما دی اور چل دیے میں

ان کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ کیا خانوادہ ہے کہ زہد اور تقویٰ دوسری پشت تک چلا جا رہا ہے یہ دس دس ریال کے گیارہ نوٹ تھے رات سے اب تک جب بھی میں نماز کے لیے کھڑا ہوا تو ان کی شکل سامنے آجاتی ہے اور میں رونے لگ جاتا ہوں کہ یا اللہ کیسے کیسے لوگ اب بھی موجود ہیں وہ چار فروری کی پرواز سے وطن واپس جا رہے ہیں دو فروری کو مدینہ سے جدہ روانہ ہو جائیں گے انھوں نے پاکستان میں ملنے کی بہت تاکید کی۔ آگے بھی ان سے ملتا رہتا تھا لیکن اس دفعہ انھوں نے جو شفقت کی ہے اس کا تو میں اظہار بھی کر نہیں سکتا اور نہ ہی میرے پاس اس کے اظہار کا یارا ہے۔

دوپہر تک عائشہ بے چاری ادھ موئی پڑی رہی دوپہر کو قدرے افاقہ ہوا لیکن کمزوری اتنی ہو گئی جیسے مہینوں کی بیمار ہو اس کے بعد وہ اٹھی کچھ تھوڑا سا ناشتہ کیا اور وضو کر کے مسجد میں چلے گئے یہاں مردوں اور عورتوں کو ایک دروازے سے داخل ہونے کی اجازت نہیں بالخصوص نماز کے وقت باب جبریل اور باب عثمان مستورات کے لیے وقف ہیں۔ باقی دروازوں سے مرد اندر جا سکتے ہیں۔ چنانچہ عائشہ تو باب جبریل سے اندر چلی گئی لیکن میں نے ایک دکان کے تھڑے پر نماز ادا کی کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی۔

یہاں زندگی اتنی تیز اور مصروف ہے کہ دل جمعی سے لکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا اس وقت شام کی نماز کے لیے بھاگ دوڑ کا سماں ہے۔ مکے میں حرم کے اندر اتنی وسعت اور کشادگی تھی کہ وہاں نمازوں کے دوران بھی بیٹھ کر لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں مسجد نبوی وسعت اور کشادگی کے لحاظ سے حرم کے مقابلے میں بہت مختصر ہے اور فدائیوں کی تعداد ان گنت ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا ہی نہیں چھلتا۔ بلکہ ایک دوسرے کے اوپر سجدہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں بیٹھ کر لکھنا ناممکن ہے پہلے دن میں نے چار صفحے مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر جو لکھے وہ واقعی کمال تھا۔ کیونکہ نماز ظہر سے ہم بہت پہلے چلے گئے تھے اس لیے تھوڑی بہت جگہ مل گئی۔

۲/ فروری

آج مدینہ میں پہلا جمعہ ہے اس وقت صبح کے جدہ کے وقت کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ہیں اور پاکستان میں اس وقت صبح کے نو بجے۔ مسجد نبوی کے کھلے صحن میں بیٹھا ہوں تہجد کے نوافل ادا کر چکا ہوں اور اب فجر کی اذان کا منتظر ہوں فجر کی اذان میں تقریباً چالیس پچاس منٹ باقی ہیں آج میں دو دن کے بعد روزنامچہ مسجد میں لے آیا ہوں اس لیے کہ اس وقت تہجد اور فجر کے درمیان وقت مل جاتا ہے ہم نے پورے دو دن اب مدینہ میں گزارے ہیں ویسے تو تین راتیں بسر ہو چکی ہیں لیکن جہاں تک نمازوں کا تعلق ہے وہ ہم نے دس نمازیں ادا کر لی ہیں۔ باقی تیس نمازیں رہ گئی ہیں، ان نمازوں میں صرف وہی نمازیں شمار ہوتی ہیں جو فرض ہیں ان میں تہجد یا اشراق یا چاشت وغیرہ کی نمازیں شمار نہیں ہوتیں کیونکہ یہ نوافل ہیں فرض نہیں ہیں۔

مسجد نبوی کی عمارت پر ابھی سلطنت عثمانی کی چھاپ زیادہ نمایاں ہے، حرم کی اتنی توسیع ہو چکی ہے اور سعودی حکومت نے اس تیزی سے اس کی تعمیر کی ہے کہ اب سلطنتِ عثمانیہ کی تعمیرات اس میں دب گئی ہیں اور سعودی حکومت اور اس کی تعمیر زیادہ حاوی ہو گئی ہے لیکن یہاں مسجد نبوی کو بھی سعودی حکومت کافی وسیع کیا ہے اور اس کی تعمیر خاصی پرشکوہ ہے لیکن چونکہ روضۂ رسول، منبر رسول اور مختلف ستونوں اور روضۃ الجنت وغیرہ پر تمام تعمیر سلطنتِ عثمانیہ کے دور کی ہے اس لیے اسی کا شکوہ نمایاں اور چھاپ گہری ہے دوسرے اس عمارت کا رنگ سُرخ ہے اور گنبد سبز ہیں۔ اس لیے ان دو رنگوں کی آمیزش نے بھی تاثر کو زیادہ شدید کر دیا ہے ویسے ان دونوں حکومتوں کے طرزِ تعمیر سے ان کے مسلک بھی نمایاں ہوتے ہیں، کم از کم مجھے محسوس ہوتے ہیں اولاً سعودی حکومت نے حرم کی وسعت، کشادگی عظمت وشکوہ کو ترجیح دی ہے اور یہاں مسجد نبوی میں بھی انھوں نے قریب قریب وہی طرزِ تعمیر قائم رکھا ہے لیکن پہلی توجہ حرم کی طرف سے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عثمانیوں نے اپنی زیادہ توجہ روضہ

اقدس اور اس کے قرب و جوار پر دی ہے۔ اس لیے کہ عثمانیوں میں شخصیت پرستی چونکہ تھی یہ شخصیت پرستی ایک گونہ شرک کی حدوں کو چھونے لگتی ہے اور وہ رسول خدا کو خدا کا درجہ دینے کی طرف مائل ہوتے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ جذبہ اس تعمیر، اس کے نقش و نگار، اس میں جو بے نظیر بلوری قمقمے لٹک رہے ہیں جو قالین بچھے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی جذبے کی تشفی کے لیے ہے، اب بھی ترک جب روضۂ اقدس پر آتے ہیں تو ہمارے لوگوں کی طرح بوسہ دینے پر مُصر ہوتے ہیں۔ سجدہ کرنے کے لیے تڑپتے ہیں یہ وہی انسان کے اندر چھپا ہوا جذبہ ہے جو ان دیکھے خدا سے زیادہ اس کی صفات کو اپنے جیسے گوشت پوست کے انسان سے منسوب کرنا چاہتے ہیں، رسُول خدا سے عقیدت عام طور پر پرستش کی حدوں کو چھُونے لگتی ہے یہ بھی انسان کی اسی کمزوری کا اظہار ہے کیونکہ رسول اللہ کو وہ اپنے ذہن میں متشکل کر سکتا ہے وہ ان کی زلف دراز کا تصور کر سکتا ہے۔ وہ ان کے سفید رنگ کو اپنے سامنے لا سکتا ہے وہ ان کی ریش مبارک کو خیال ہی خیال میں چوم سکتا ہے۔ لیکن خدا کو وہ متشکل نہیں کر سکتا اس لیے کہ خدا تو اصرار کرتا ہے کہ وہ بے شکل ہے، وہ صرف جذبہ ہے کبھی رحم ہے کبھی غضب۔ لیکن انسان رحم، مہربانی، عنایت سے اس وقت تک لطف اندوز ہی پوری طرح نہیں ہوتا جب تک وہ کسی انسان کی طرف سے نہ ہو۔ اسی طرح یہ غیظ و غضب سے بھی ڈرتا ہے تو اس کو بھی وہ کسی نہ کسی انسان کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کی دہشت اور سزا میں زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ اسی لیے عام طور پر ہمارے مسلمان حبیبؐ کا واسطہ دیتے ہیں اس کے توسط سے عنایات کے طالب ہوتے ہیں اس کے مقابلے میں سعودی حکومت کا مسلک خدا کی عظمت پر زیادہ مصر ہے ان کے نزدیک خدا کی وحدانیت کو ہر حالت میں بلند و بالا رکھنا ہوگا اسی لیے ان کے نزدیک حرم شریف کا مقام بلند و ارفع ہے کیونکہ وہ بیت اللہ ہے دیسے تو تمام مسلک اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب عمل ہوتا ہے تو اس میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور یہ فرق فنِ تعمیر سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں ہوتا ہے جب خدا کو آپ عظیم اور لاشریک عملاً مانیں گے تو پھر اس کے بعد تمام دوسری چیزیں خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں اس کے تابع ہو جائیں گی خواہ وہ قرآن ہو یا قبلہ یا رسول، اب سعودیوں کے مسلک کا نتیجہ ہے کہ قرآن پڑھ رہے ہیں اور اُوپر سے گزر رہے ہیں۔ جو تیاں بھی لے کر جاتے ہیں وہ قرآن کو نہ چومتے

ہیں نہ آنکھوں کو لگاتے ہیں۔ تلاوت کرتے ہیں اس لیے کہ وہ اس کی زبان سمجھ سکتے ہیں وہ ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہم جب تلاوت کرتے ہیں تو ہم صرف ایک جذبۂ عبودیت سے مسخر ہو کر کرتے ہیں اس کو سمجھتے نہیں چنانچہ جس چیز کو ہم نہیں سمجھتے ہیں اس کو ہم غلاف در غلاف لپیٹ کر رکھتے ہیں یہاں کعبے کی طرف ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے یا ہیں لیٹتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں نماز پڑھتے ہوئے شخص کے آگے سے گزرنے کو سخت تنبیہ کی جاتی ہے لیکن یہاں گزرتے ہیں۔ جوتی صاف ہو تو اس کے ساتھ نماز بھی پڑھ لیتے ہیں حرم کے اندر بھی چلے جاتے ہیں ویسے یہ فرق تو ہمیشہ غالباً رہے گا۔ اور اس کی وجہ سے خاصے اہم تضاد قائم رہیں گے سب سے بڑا تضاد تو اسلامی نیشنلزم کا ہے۔ دوسرے اسلام اور علاقائی قوم پرستی کا ہے۔

اب سعودی حکومت اسلامی نیشنلزم کی داعی کیوں ہے۔ اس لیے بھی وہ اسلامی نیشنلزم پر اصرار کرتی ہے کہ اگر اسلامی نیشنلزم جاری وساری ہو تو اس کی قیادت اسی حکومت کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے جہاں بیت اللہ ہے، جہاں مسجد نبوی ہے۔ جہاں کونے کونے سے مسلمانوں کو سرنگوں آنا ہے صرف یہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متاثر کر سکتی ہے اور جہاں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں وہاں کی حکومتوں کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔

صرف یہی تضاد نہیں بلکہ ہم جیسے ملکوں میں کچھ اور تضاد بھی ہیں۔ بلکہ ہم جیسے ملکوں سے مراد وہ ملک ہیں جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ اب وہاں اسلام کی توجیہہ، اس کی وضاحت اس کے احکام کی تشریح لامحالہ ایک ایسے گروہ کے سپرد ہو جاتی ہے جو عربی کے قدرے ماہر سمجھے جاتے ہوں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں علماء کا ایک ایسا مخصوص گروہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ علماء، مفتی اور قاضیوں کا گروہ بہت پرانا ہے۔ اور حکومتوں کے موافق ومخالف ان کے کردار رہے ہیں اور ازمنۂ وسطیٰ میں جب جاگیرداری نظام اپنے عروج پر تھا تو ان علماء نے ایک طرف حکومتوں کا ساتھ دیا تو انہی میں سے کچھ گروہوں نے بادشاہوں کے احکام اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت بھی کی اور اس کے لیے تختۂ مشق بھی بنے اس کی ترقی اور روشن خیالی کی تحریکوں کی رہنمائی بھی یہ علماء ہی کر سکتے تھے کیونکہ یہی واحد اہل علم کا طبقہ تھا جو حالات کو قدرے بدلنے کے لیے جدوجہد کر سکتا تھا اور اس وقت

کی ہر تحریک مذہب کے حوالے سے ہی ابھر سکتی تھی چنانچہ یہ عمل اس برصغیر میں بھی جاری رہا چنانچہ آج جب ہم شاہ ولی اللہ یا سید احمد کی تحریکوں کا ذکر کرتے ہیں یا پھر فرائضی تحریک کو بیان کرتے ہیں تو ان تمام تحریکوں کو ہم مذہبی سے زیادہ سماجی پس منظر میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم جیسے ملکوں میں یہ عمل ایک لازمی ولابدی ہوتا ہے اور اس برصغیر میں جب گاندھی نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو متحرک کرنے کی کوشش کی تو یہ حیرانی کی بات نہیں اس برصغیر میں یہ ایک دور ہی ایسا تھا جس میں عوام کو مذہب کے حوالے سے ہی متحرک کیا جا سکتا تھا، جس وقت میں کہتا ہوں کہ گاندھی نے مذہب کا لبادہ اوڑھا تو میرا یہ مطلب نہیں کہ اس نے کسی منافقت کی بنا پر یہ اقدام کیا بلکہ اس کے عقائد بھی تھے اور یہ عقائد وقت کی مخصوص ضرورتوں کے ساتھ خاص قسم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر سیاسی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ ہندوؤں میں بھی گاندھی کے میدان میں آنے کے بعد روشن خیال قیادت کو یا تو میدان سیاست سے ریٹائرڈ ہونا پڑا یا پھر طوہاً و کرہاً گاندھی کی ذات اور اس کے فلسفے کی قیادت کو تسلیم کرنا پڑا موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سی آر داس یہ سب اسی روشن خیال قیادت سے تعلق رکھتے تھے جو گاندھی کے مذہبی اسلوب کو دل سے کوئی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن گاندھی کا اسلوب عوام کو چونکہ متحرک کرتا تھا اس لیے وہ بے بس ہو جاتے تھے۔

قریب قریب اسی طرح کا عمل ہمارے ہاں جاری تھا۔ ہمارے ہاں کی روشن خیال قیادت جو مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم، مغربی افکار اور رہن سہن کو قبول کرتی تھی کو بالآخر مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالباری فرنگی محل کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے چنانچہ جن دنوں خلافت کا طوطی بولتا رہا نہ سر شفیع کی آواز سننے میں آئی۔ نہ جناح کی نہ آغا خان کی نہ فضل حسین کی، یہ درست ہے کہ خلافت کی تحریک کے غبارے میں سے ہوا جلدی نکل گئی۔ اس لیے یہ قیادت زیادہ دنوں مسحور نہ رکھ سکی، لیکن ہماری سیاست کو مولوی اور مذہبی زبان کا چٹخارہ ضرور مل گیا اور جب قائد اعظم کو مسلمانوں کو منظم کرنے کی ضرورت پڑی تو اس کو بھی بہت حد تک مولویوں اور اور اس زبان کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن آج جتنی بھی تاویلیں کی جائیں وہ برحق۔ لیکن ایک حقیقت اپنی

جگہ مسلمہ ہے کہ قائدِاعظم پاکستان میں ایک ایسی جمہوریت کے حامی تھے جس میں معاشرتی انصاف ہو۔ وہ کسی صورت میں بھی مولویوں کی قیادت کو تسلیم کرنے یا اس کو آگے لانے کے حق میں نہ تھے لیکن انسانی خواہشیں آسانی سے تو حاصل نہیں ہوا کرتیں چنانچہ مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک کی کامیابی کے بعد اس میں شامل مختلف عناصر پاکستان کی قیادت کے دعوے دار بن بیٹھے اور ان میں شروع میں آپس میں پس پردہ اور بعد میں کھلے بندوں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی ان عناصر میں جہاں ایک طرف جاگیر دار سیاست تھا جن کو قائدِاعظم نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا یہ اپنے آپ کو پاکستان کے خالق تصور کرنے لگے۔ دوسری طرف نوکر شاہی جس نے پس پردہ مسلم لیگ کے قائدین کی مدد کی، ان کی تقریریں لکھیں، ان کو حکومت کے اندر کی کارروائیوں سے مطلع کیا، پھر انتخابات میں ان کو جتوایا۔ یہ اپنے کو پاکستان کا اصل خالق تصور کرتے تھے اور اقتدار میں کھلے بندوں اپنا حصہ چاہتے تھے۔ تیسری طرف علمائے کرام تھے ان میں سے مسلم لیگ کے حامی بھی اور مخالف بھی۔ مخالف یہ سمجھتے تھے کہ جن جذبات کو ابھار کر مسلم لیگ نے ان کے ہاتھوں سے قیادت چھینی ہے اب انہی جذبات کو وہ بطور ہتھیار مسلم لیگ اور اس کی حکومت کے خلاف کیوں نہ استعمال کریں؟ چنانچہ یہ عمل آج پچیس چھبیس برس گزر جانے کے بعد بھی جاری ہے بھٹو نے نوکر شاہی کو قدرے سرنگوں کر لیا ہے لیکن مولوی اس کے خلاف صف آرا ہیں اور وہ اپنے کو اسلامی نظام حکومت کے نام پر حکومت اور قیادت کا واحد اجارہ دار سمجھتے ہیں۔

یہ کشمکش بہت طویل اور گھمبیر ہے۔ یہ اوقاف کو اپنی تحویل میں لینا، پھر مذہبی امور کی وزارت کی تشکیل، حج کے لیے ایک لاکھ افراد کو سہولت یہ سب اسی لڑائی کے مختلف پہلو ہیں، دوسری طرف مولوی، زمیندار، سرمایہ دار سب ایک محاذ میں ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دار اور جاگیر دار کو فقط سوشلزم سے چڑ ہے وہ اس نعرے میں موت کا پیغام تصور کرتا ہے اور "عالم" کے مفادات بہت حد تک اسی طبقہ سے وابستہ ہیں۔ زکوٰۃ، خیرات، دینی مدارس کے لیے چندے یہ تمام ضرورتیں غیر شعوری طور پر علماء کو اس طبقے سے وابستہ کر دیتی ہیں، اب بظاہر علماء میں دو طبقے ہیں، ایک اوقاف سے وابستہ عالم اور حکومت کی مراعات سے نوازے جانے والے علماء، دوسری طرف سرمایہ دار

اور جاگیر دار طبقے سے وابستہ علماء، یہ اب آمنے سامنے صف آراء ہوں گے لیکن ایک وہ غریب امام مسجد ہے جو گاؤں کی معمولی سی مسجد میں نماز پڑھاتا ہے، جنازے کا اہتمام کرتا ہے، جس کی حیثیت گاؤں میں کمی کی سی ہے اس کو جلد یا بدیر منظم ہونا ہوگا اور وہ گاؤں کے کمیوں، بے زمین کاشت کار، مزارعے اور چھوٹے زمینداروں کی جو بھی تنظیم ابھرے گی اس میں شامل ہوگا اور وہ ان بڑے بڑے متحارب عالموں کا پردہ چاک کرے گا۔

مسجد نبوی میں منبر رسولؐ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ نماز سے چار گھنٹے پہلے آگیا ہوں تو یہ جگہ حاصل کر سکا ہوں۔ لیکن چاروں طرف دھکم پیل ہے، گریہ وزاری ہے، رقت ہے، منبر کے سامنے نوافل ادا کرنے اور دعا مانگنے والوں کا ہجوم ہے۔ ایک عجیب کیفیت ہے۔ میں بھی نوافل پڑھ چکا ہوں اور درود و سلام بھی بھیج چکا ہوں۔

عجیب و غریب کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ اس کیفیت کا تجزیہ میں اس وقت نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ رویا ہوں اور وہ آنسو بہائے ہیں کہ شاذ ہی ایسا ہوا ہو۔ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی چاہی ہے اور رسولؐ کی شفاعت کا طالب ہوا ہوں۔ میرے ارد گرد پرنم آنکھوں اور رقت بھرے چہروں کا ہجوم ہے۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے گڑگڑا کر دعا مانگنے والے یا گریہ وزاری کرنے والے نظر آتے ہیں منبر رسولؐ میرے بالکل دس قدم پر ہے اور بائیں طرف روضۂ رسولؐ ہے اور سامنے وہ مقدس ستون ہیں جن کے ساتھ ایک نہ ایک تاریخی واقعہ وابستہ ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو ریاض الجنۃ کہلاتی ہے اور یہاں جگہ حاصل کرنے کے لیے بے مثال دھکم پیل ہوتی ہے۔ اس وقت بھی نماز میں تین گھنٹے رہتے ہیں کہ یہ پوری جگہ پُر ہو چکی ہے اور سجدہ کرنا محال ہو رہا ہے، اکثر سجدہ دوسروں کی پشت پر یا پاؤں پر کرنا پڑتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے لیے کل سے ہی ہم نے نیت باندھی ہوئی تھی۔ چنانچہ آج فجر کی نماز کے فوراً بعد میں کمرے میں پہنچا اور چیزیں درست کیں، جاتی دفعہ دودھ کے ڈبے لے گیا تھا، اتنے میں عائشہ آگئی۔ نور الحسن اور چودھری یوسف نان لے آئے، ناشتہ کیا۔ اس کے بعد برتن دھوئے، کمرہ صاف کیا، عائشہ نے اور میں نے تمام کپڑے دھو ڈالے غرضیکہ نو بجے تک میں اور عائشہ تیار ہو کر مسجد میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایسے سمے جب دھکم پیل ہو رہی ہو

کوئی کندھے سے کندھا پھاندر رہا ہو اور کوئی ٹانگوں سے ٹکرا رہا ہو۔ کیونکہ ہر ایک روضہ مقدس اور ستونوں کا قرب چاہتا ہے اس دھکم پیل اور دھینگا مشتی میں نہ تو لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی پوری توجہ سے عبادت ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہی درود و سلام ہی بھیجا جا سکتا ہے اس لیے اب یہاں پر لکھا جانا قریب قریب ناممکن ہو رہا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کچھ درود و سلام ہی بھیجوں لیکن یہاں ایک ایک منٹ میں دو دو تین تین لوگ جگھوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو کیا درود اور کیا سلام۔ بہرحال یہ بھی یہاں کا ایک حصہ ہے جمعہ کی وجہ سے یہ کھینچا تانی آج زیادہ ہی ہے اور جھگڑ جھگڑ کر تنگ آ چکے ہیں۔

زبان اور عبادت کے رشتے کا تجربہ جتنا ان دنوں میں ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا میں نے طواف ہوں یا درود یا صفا و مروہ کے چکر پوری عبادت اپنی زبان میں کی ہے اور جتنا لطف مجھے اس عبادت میں آیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ عربی آیات کا بھی اسی وقت لطف آتا ہے جب ان کی سمجھ ہو اگر سمجھ نہیں ہے تو پھر یہ سب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور وہ سکون اور تشفی نہیں ہوتی جو عبادت کا اصل مقصد ہے، جس وقت انسان دعا کرتا ہے اپنی بے بسی اور بے کسی کا اعتراف کرتا ہے اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے اور پھر اپنی تلخیوں اور محرومیوں کا رونا روتا ہے اور انکی دوری کیلیے دعا کے واسطے ہاتھ اٹھاتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اسکی یہ تلخیاں دور ہو جائیں یہ محرومیاں مٹ جائیں، لیکن وہ یہی سمجھتا ہے اور یہی احساس اسکے تمام غموں کو دور کر دیتا ہے اسکی رُوح کو تسکین پہنچاتا ہے کہ اب اسکی تمام مرادیں پُوری ہو جائیں گی۔ اس کے غم دور ہو جائیں گے اس کی تمام خواہشیں اور تمنائیں پوری ہو جائیں گی اور یہ عجیب و غریب کیفیت ہوتی ہے کہ اگر بھٹو اپنے وعدے پُورے نہیں کرتا تو وہ گردن زدنی ٹھہرتا ہے، عوام اپنا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور وہ قدم قدم پر اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں اور وہ تکمیل نہیں پاتی تو انسان یہی سمجھتا ہے کہ اس کی دعاؤں میں، اس کی عبادت میں، اس کی گریہ زاری میں، اس کی گڑگڑاہٹ میں اسکی التجا میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ یہ ایک شدید نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے اور عبادت کا اس نفسیات سے بہت ہی گہرا

تعلق ہے۔

اپنی طرف سے پہلے آیا تھا اور صبح سویرے سے اس کے لیے اہتمام کیا کہ یہاں اول صفوں میں بیٹھ کر زیادہ خشوع و خضوع سے عبادت کی جاسکے گی لیکن دو نفل بھی اب تو پڑھنے مشکل ہو رہے ہیں اور سجدہ کرنا قریب قریب مشکل اور ناممکن ہے۔ یکسوئی اور پوری توجہ سے عبادت تو بہت دور کی بات ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف مسجد میں داخل ہونا ہی عبادت سمجھ لیا گیا اور یکسوئی اور عبادت کی کوئی اہمیت تصور نہیں ہوتی، زود یا بدیر عبادت کے یہ طریقے بدلنے ہوں گے اب معلوم نہیں یہ کیسے ہو سکے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ دھکم پیل ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اور دو رکعت بھی ادا نہیں کی جاسکتیں کیونکہ جب تک اس امر پر پابندی نہیں ہوگی کہ جو پہلے آگیا اور جب جگہ پُر ہو جائے تو پھر مزید آدمیوں کو ان صفوں میں گھسنے اور اور پھلانگنے کی اجازت نہ دی جائے۔

۳ فروری

ہفتہ ہے اور وہی معمول کہ تہجد کے نوافل ادا کر چکا ہوں اور فجر کی اذان کا منتظر ہوں یہاں اگر کوئی وقت مقابلتہً کم ہنگامہ پرور اور کم شور و شغب والا ہے تو وہ یہی ہے اور وہ بھی اسی صورت میں اگر آپ پیچھے بیٹھے ہوں ورنہ آگے کی جو کیفیت ہے اس کا نقشہ میں نے اپنے کل کے روزنامچے میں کچھ کھینچا تھا یہاں کی زندگی اور مکے کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں وقت اتنا کم ہوتا ہے اور عبادت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ زندگی بہت تیز ہو جاتی ہے اور اس تیزی میں اگر ذرا سا بھی فرق آجائے تو پھر وہی "یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد" والا معاملہ ہوتا ہے کل جمعہ کی نماز کے بعد طبیعت خراب ہو گئی اس طبیعت کی خرابی میں کچھ نفسیاتی وجوہات بھی تھیں کل صبح نو بجے جب میں مسجد میں آیا تو مجھ پر عبودیت اور عجز و انکساری کی عجیب کیفیت تھی اور اس کا اظہار بھی ابتداء کی دعاؤں اور

نوافل میں ہوا لیکن بعد میں اس قدر ہجوم اور اس قدر بھیڑ بھڑ کا ہوا کہ عبادت تو کجا نماز بھی صحیح طریقے سے ادا نہ ہو سکی۔ اس کا طبیعت پر بہت اثر ہوا جب مسجد سے باہر نکلا تو بھوک سے بھی نڈھال تھا۔ چنانچہ جب ہوٹل پہنچا تو عائشہ بھی پہنچ گئی اس کا بھی یہی حال تھا اتنے میں ہمارے ہم سفر نور الحسن نان لے آتے اور پکوڑے بھی، ہم نے اچار اور پکوڑے اور پھر نور الحسن ہوٹل سے دال لے آیا یہ کھانے بھوک زیادہ تھی اس لیے کھانا بھی کچھ زیادہ کھا لیا اس وقت تو یہ بسیار خوری محسوس نہ ہوئی لیکن بعد میں اس نے طبیعت کو بہت بوجھل کر دیا ساتھ ہی اعضاء شکنی بھی شروع ہو گئی یہ حال میرا ہی نہ تھا بلکہ ہم سفر بھی اعضاء شکنی اور حرارت کی شکایت کر رہے تھے میرے نزدیک اس کی وجہ وقت کی تنگی عبادت کی خواہش اور مسجد نبوی میں دل جمعی اور یکسوئی سے عبادت نہ کر سکنے کی وجہ سے یہ تمام شکایت ہوتی ہے۔

آج مدینے میں ہمارا چوتھا دن ہے آج عشاء کی نماز کے بعد انشاءاللہ ہماری نصف نمازیں پوری ہو جائیں گی، اس وقت پھر ہجوم شروع ہو گیا ہے اور اتنی DISTURBANCE ہے کہ نہیں لکھا جاتا۔ مجھے رہ رہ کر حرم کا سکون یاد آتا ہے اگر یہاں اس مسجد میں بھی وسعت ہو اور لوگ دل جمعی کے ساتھ بیٹھ سکیں تو غالباً یہاں اس سے بھی زیادہ سکون اور عبادت سے رُوحانی تسکین حاصل ہو۔ میرے نزدیک زود یا بدیر یہاں پر بھی چھت بنانی ہی پڑے گی۔ کہتے ہیں کہ علماء اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اُوپر کی چھت سے روضۂ اقدس کی بے ادبی ہو گی، لیکن اس کا کوئی علاج ڈھونڈا جا سکتا ہے اتنے حصے کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس مسجد کی توسیع ایک ضروری امر ہے اور اس کی طرف سعودی حکومت پوری توجہ دے رہی ہے۔

• معلوم نہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ترکوں نے جو تعمیر کی ہے اس سے مجھے شرک کی بُو آتی ہے اور ویسے یہاں زائرین کا ہجوم بھی شرک و بدعت میں شدید طور پر مبتلا ہوتا ہے اور جالی کو چومنے کے لیے بے تابی اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں اور پھر محافظ کو جو وہاں کھڑے ہوتے ہیں ریال بھی تھما دیتے ہیں اور وہ ریال لے کر منہ دوسری طرف کر لیتا ہے۔

اس قسم کے بین الاقوامی اجتماعات میں ہر قوم اور ہر ملک کے بسنے والوں کے مخصوص اور

نمایاں عادات وخصائل کا دلچسپ مطالعہ کیا جا سکتا ہے ، اب مثال کے طور پر یہاں جتنے افریقی آئے ہیں ان کے بارے میں ہمارے ہاں کے لوگوں کا جو تاثر ہے اس میں ان کے وحشیانہ پن کا اقرار ہے۔ یہ افریقی بغیر کسی تکلف کے جگہ ہو یا نہ ہو صف کے اندر آگھسیں گے اور گھستے ہی نماز کی نیت باندھ لیں گے۔ آپ جتنا چاہیں احتجاج کرتے رہیں وہ نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں یہ سطریں لکھ رہا ہوں کہ میرے ساتھ جو ایرانی بیٹھا ہے۔ بالکل اس کی گود میں ایک مصری یا کسی دوسرے عرب ملک کا باشندہ نماز کے لیے آکھڑا ہوا ہے ، اب اس قسم کی نماز کے کیا معنی اور کیا افادیت ہے۔

نماز فجر کے بعد کراچی کے عبدالرؤف صدیقی سے ملاقات ہو گئی اس سے گپ ہوتی رہی۔ اتنے میں اس کے ایک تاجر دوست آ گئے۔ وہ سعودی عرب کے ساتھ تجارتی تعلقات کے بارے میں روشنی ڈالتے رہے انھوں نے بتایا کہ یہاں کی مارکیٹ پر ہندوستان چھایا ہوا ہے اور پاکستانی تاجر کے لیے ہندوستان کی اجارہ داری کو توڑنا قریب قریب ناممکن ہے اس لیے کہ ہندوستانی تاجر کے عرب تاجر سے پچیس تیس سال پرانے تعلقات ہیں صرف یہی نہیں بلکہ عرب تاجر اس سے لاکھوں کا مال ادھار لیتے ہیں اور اس کو آہستہ آہستہ ادا کر دیتے ہیں۔ تیسرے ہندوستانی تاجروں نے یہاں اپنے دفاتر قائم کیے ہوتے ہیں اور براہ راست اپنے ملک سے مال منگاتے ہیں اور ان عرب تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور جیسے جیسے عرب تاجر آگے فروخت کرتے ہیں اور یہ ہندوستانی تاجروں کے کارندے رقمیں وصول کرتے جاتے ہیں۔ پاکستانی تاجر اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ دوسرے عرب تاجر خاصے بے ایمان قسم کے لوگ ہیں انھوں نے اپنی ایک مثال دی کہ گھریلو دستکاری کی مصنوعات یہاں روانہ کیں۔ بنک کے ذریعے مال بھجوایا لیکن عرب تاجر نے نہ تو چھڑوایا اور نہ ہی خط کا جواب دیا۔ بالآخر ایک دوست کو جو عمرہ کے لیے آرہا تھا یہ کام کرنے کے لیے کہا تو پتہ چلا کہ مال اس کے پاس پہنچ چکا ہے اور اس نے فروخت بھی کر لیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عرب تاجر نے کسٹم والوں سے مل کر مال طے کیا اس کا کاغذوں پر کوئی اندراج نہیں اور نہ ہی بنک والوں کو علم ہے اس کے علاوہ عبدالرؤف صدیقی نے بتایا کہ امریکہ

سے سعودی عرب کو جو سالانہ درآمد ہوتی ہے وہ ۸۵۰ ملین ڈالر ہے اس طرح انگلستان سے ۶۵۰ ملین ڈالر ہے اور مغربی جرمنی اور جاپان سے بھی تقریباً پانچ سو ملین کے قریب تجارت ہے۔ امریکہ کے صنعت کاروں اور تاجروں کے ہاتھ میں سعودی عرب سے زیادہ محفوظ مارکیٹ اس وقت اور کوئی نہیں اب کچھ اشیا۔ عوامی جمہوریہ چین COMPETE کرنے لگا ہے لطف یہ ہے کہ سعودی عرب نے ابھی تک چین سے تعلقات قائم نہیں کیے چین کا بنا ہوا تمام مال کویت کے راستے یہاں آتا ہے۔

مسجد سے اٹھا اور کمرے میں آیا تو دیکھا کہ نور الحسن بے چارہ بیمار ہے اس کو حرارت ہے عائشہ نے چائے بنائی اور اسپرو اس کو دی اور میں نے بھی فقط ایک نیم ابلے ہوئے انڈے سے ناشتہ کیا کیونکہ پیٹ بوجھل تھا رات پیٹ میں خاصا درد ہوتا رہا اور ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی اور پیشاب بھی دو تین بار آیا۔ چنانچہ صبح ٹھیک چار بجے یعنی پاکستان میں اس وقت صبح کے دو بجے ہوں گے اٹھ بیٹھا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر لیٹ گیا کہ شاید کچھ نیند آجائے مگر ابھی تہجد کی اذان کو ایک گھنٹہ باقی تھا پھر اٹھ بیٹھا۔ باسی پانی کا ایک گلاس پیا اور اس کے بعد میں نے چائے بنائی تو عائشہ اور باقی لوگ بھی اُٹھ بیٹھے۔ میں نے چائے پی تو اس سے ایک کھل کر اجابت ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد بھی پیٹ بوجھل رہا اس لیے ناشتہ نہ کیا۔ ناشتہ کے بعد یہاں کے مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے گئے۔ ایک ٹیکسی لی اور اس کو تمام زیارتوں کے لیے تیس ریال دینے کیے ہم چھ افراد تھے اس طرح پانچ پانچ ریال ہر ایک کے حصے آئے۔

آج جو تاریخی عمارتیں دیکھیں ان میں مسجد قبلتین، مساجد خمسہ۔ جن میں مسجد فتح، مسجد علی عمر، فاطمۃ الزہرا وغیرہ تھیں۔ پھر جنگ احد میں شہید ہونے والوں کی جائے مدفن، مسجد قبا، خاکِ شفا اور باغ سلمان فارسی شامل تھے۔ ان زیارتوں میں نوافل ادا کرتے ہوئے اور دیکھے ہوئے تقریباً ساڑھے چار گھنٹے لگ گئے جب ہم واپس آئے تو ظہر کی نماز میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا آکر چائے بنائی اور پی اس کے بعد ظہر کے لیے چلے گئے میں نے تو باب جبریل کے سامنے دکان کے تھڑے پر ہی نماز ادا کی اور ہزاروں نمازیوں نے وہیں نماز ادا کی، نماز کے

کے دوران اس قدر نیند نے غلبہ کیا کہ بصد مشکل نماز ادا کی جا سکی - اس کے بعد بھاگم بھاگ کمرے میں آیا اور سو گیا - سبھی دوسرے لوگ بھی آ کر سو گئے - ہم تقریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے سوئے ہیں لیکن نورالحسن بے چارے کو سخت حرارت ہے - اس کا بدن تپ رہا ہے دراصل قبض ہے جس کی وجہ سے اچھا ہم میں سے کوئی بھی نہیں، نماز عصر کے بعد میں اور یوسف ٹکٹ لے کر سعودی عرب ائرلائنز کے دفتر میں گئے دراصل وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر جمعرات ۸ فروری کو شام کی بجائے صبح کی کوئی نشست مل جائے تو ہم جدے جلدی پہنچ جائیں اور وہاں سے شاید کوئی کراچی کی ایک دن پہلے کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن سعودی ایرلائنز والوں نے کہا کہ شام کی ہی پرواز ہے، بہرحال وہاں جانا بہتر ہو گیا اس نے ٹیلیفون کر کے ان نشستوں کے بارے میں CONFORM کیا اور ہمیں کہا کہ ہم بدھ کو پھر آئیں - اس کے بعد واپس آتے اور آتی دفعہ دلیا خرید لیا کہ نورالحسن کو دلیا دیا جائے آتے تو عائشہ بھی ہوٹل میں داخل ہوتے مل گئی اس نے بتایا کہ کرنل منان اور اس کی بیوی فخر راستے میں مل گئی اور وہ ابھی آتے ہیں جب ہم کمرے میں پہنچے تو نورالحسن کا بدن سخت تپ رہا تھا اور اس کو بخار تیز تھا۔ عائشہ نے دلیا بنایا اور اس کو دیا - ہم سب نے کھایا۔ اس سے ذرا اطمینان ہوا اتنے میں کرنل منان اور فخر آ گئے، انھوں نے نورالحسن کو دیکھا اور دوائی لکھ کر دی - ان کو چائے پلائی - پھر اس کے بعد ہم چاروں، عائشہ، فخر، میں اور منان شام کی نماز کے لیے اکٹھے نکلے نماز سڑک پر ہی پڑھی - عائشہ اور فخر اندر چلی گئیں - شام ہم نے یہاں کا مخصوص کھانا بن اور قہبہ کھایا - اس کے بعد منان اپنے کمرے میں لے گیا یہ حیدر الحیدری کی نئی عمارت ہے کمرے اچھے ہیں لیکن علاقہ سخت خراب ہے اور مسجد سے خاصا دور ہے، لفٹ بھی کوئی نہیں، وہ دیکھ کر ہمیں اپنے کمرے پر شدید اطمینان ہوا، عشاء کی نماز واپس آ کر پڑھی واپس آتے تو یوسف روٹیاں لے آیا اور عائشہ نے ٹماٹر ڈال کر انڈوں کی بھرجیا بنائی بہت لطف آیا اور عائشہ کو سبھی نے دعائیں دیں -

۴؍ فروری

تہجد کے نوافل پڑھ کے فارغ ہوا ہوں اور حسب معمول یہ سطور لکھ رہا ہوں آج مسجد کے اند اور بالکل پیچھے سرے پر بیٹھا ہوں کہ شاید بھیڑ کم ہو اور دھکے کم پڑیں دیکھیں کیا ہوتا ہے ابھی تو لوگ آرہے ہیں، آج بے چارہ نورالحسن تہجد کے لیے نہیں اٹھ سکا اس کو کتنی کوفت ہو رہی ہو گی انشاءاللہ وہ نماز میں شامل ہو جائے گا۔

حرم میں فقراء کی ایک تعداد ہوتی ہے لیکن یہاں مسجد نبوی میں مانگنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اس سے بھی خاصی پریشانی ہوتی ہے۔ کل جو تاریخی مساجد وغیرہ دیکھنے گئے وہاں بھی مانگنے والی بچیوں اور جوان عورتوں کا ہجوم تھا۔ یہ فقراء کی ٹولیاں سعودی حکومت کا کوئی اچھا اثر نہیں ڈالتیں اس طرف حکومت توجہ کرے تو چند دنوں میں اصلاح ہو سکتی ہے۔

اب جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں تو بالکل ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہوں یہ تو یہاں مصروفیت اتنی ہے کہ بور ہونے کی فرصت نہیں ملتی اگر کہیں فرصت ہوتی تو بوریت کا شدید احساس ہوتا۔ ہماری نصف نمازیں اللہ کے فضل و کرم سے پوری ہو چکی ہیں اور باقی نصف بدھ کو عشاء کے وقت پوری ہو جائیں گی آج اتوار ہے پیر، منگل، بدھ تین دن رہ گئے ہیں۔

اس دفعہ حج کی تقریبات میں پاکستان اور کسی حد تک ہندوستان کی ایک خصوصیت بہت ہی نمایاں رہی کہ نوجوان مرد اور عورتوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، باقی ممالک میں تو پہلے سے ہی یہ رجحان موجود ہے چنانچہ انڈونیشیا میں تو متمول مسلمانوں کے لڑکوں کی اس وقت تک شادی نہیں ہوتی جب تک کہ نوجوان لڑکے اور لڑکی نے حج نہ کیا ہو۔ لیکن پاک و ہند میں عام طور پر یہی روایت رہی ہے کہ جب اعضاء جواب دینے لگیں۔ دنیاوی کام انجام نہ دیے جا سکیں پھر حج کے لیے چل نکلو۔ لیکن اس دفعہ صورتِ حال بالکل مختلف ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ بوڑھے مرد اور عورتیں نہیں آتے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اب کم

از کم تیس سے چالیس فیصد جوان لوگ بھی آتے ہیں اور مذہبی شیفتگی کا اظہار پہلے کے مقابلے میں نمایاں ہے جوان لوگوں میں سب سے زیادہ تعداد میں گجرات، کاٹھیا واڑ کے بوروں اور میمنوں کی دیکھی ہے یہ دیس دیس سے آتے ہیں۔ ہندوستان سے آتے ہیں۔ پاکستان سے آتے ہیں اور پھر افریقی ممالک اور یورپی ممالک سے خاصی تعداد میں آتے ہیں۔ دراصل یہ گجرات کاٹھیا واڑ کے باشندے افریقی ممالک میں اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں اور وہاں کی تجارت پر یہ لوگ چھائے ہوتے ہیں دراصل ان کا اسلام سے تعلق پاک و ہند کے باشندوں میں سے سب سے پرانا ہے کیونکہ یہ ہندوستان کی کھتری ذات سے متعلق تھے اور تجارت کرتے تھے۔ عرب تاجر جب بحری جہاز لے کر سورت کی بندرگاہ پر پہنچنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے تجارتی تعلقات اسی آبادی سے ہوئے ان تاجروں کے ذریعے ہی یہ اسلام کی طرف مائل ہوئے یہی وجہ ہے کہ ان میں مذہب بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ حاکم کا مذہب سمجھ کر مسلمان نہیں ہوئے بلکہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا ہوگا تو یہ زبردست بغاوت تصور کی گئی ہوگی۔ دوسرے یہ گجراتی تاجر پیشہ ہونے کی وجہ سے متمول بھی ہیں اور ان میں اتنی مالی سکت ہے کہ یہ پورے خاندان کے ساتھ حج کر سکیں اسی طرح بہت سے پاکستانی انگلستان اور بیرونی ممالک سے بھی حج کے لیے آتے ہیں ویسے پاکستان میں بھی تاجر طبقہ اب اتنا جاندار ہو گیا ہے کہ وہ اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر حج کو آتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ اب مقابلتہً حج آسان بھی ہو گیا ہے۔ اب یہاں پیسہ خرچنے سے ہر قسم کی سہولت اور آرام میسر آسکتا ہے۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں مسجد سے نکلا تو مکھن خریدنے کے لیے گیا تو اب اس نے اڑھائی ریال قیمت بتائی حالانکہ دو دن پہلے میں اسی دکان سے یہی مکھن دو ریال میں خرید کیا تھا جب اس سے کہا تو اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا کہ یہی قیمت ہے لینا ہے تو لو ورنہ ایسے عام طور پر کتابوں میں بھی لکھا ہے اور لوگوں کی زبانی بھی سنا ہے کہ مکہ کے مقابلے میں مدینے کے لوگ زیادہ با اخلاق اور نرم گفتار ہوتے ہیں لیکن مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا، وہی انداز ہیں، دھوکہ بھی وہی ہے، تجارت کی ہیرا پھیری بھی وہی ہے اور زبان میں بھی کوئی مٹھاس نہیں۔ تمام ممالک کی حکومتوں کو سعودی عرب کی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ حج کے دوران قیمتوں کا تعین کرے اور باقاعدہ اعلان کیا جائے

کیونکہ یہ لوٹ اور یہ دھاندلی حاجیوں کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔ نہ ٹیکسی کا کرایہ مقرر ہے نہ روٹی کا نہ کپڑے کا منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کی حکومتیں جو زرِ مبادلہ مقرر کرتی ہیں اس میں گزارہ ناممکن ہو جاتا ہے اور حج کے دوران قیمتوں میں پچاس سے سو فیصد اضافہ معمول بن گیا ہے مکانات کا بھی یہی حال ہے منہ مانگے دام وصول کیے جاتے ہیں۔

اب ایک طرف عبادت، اسلام کی برتری، اسکی تعلیمات کی عظمت، دیارِ حبیب کا تقدس اور دوسری طرف لوٹ کھسوٹ، منافع زراندوزی! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت اپنی جگہ ہوئی اور نفع اندوزی، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ اپنی جگہ جائز ٹھہری۔ اب یہ تمام اقدام عبادت کی نفی نہیں تو کیا ہے۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ایک سوشلسٹ معاشرے میں جہاں منصوبہ بندی ہو وہاں عبادت بھی زیادہ سکون ہو سکتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے فرض کر لیجیے کہ سعودی عرب میں ایک سوشلسٹ حکومت قائم ہو جاتی ہے تو وہ حاجیوں کی آمد کے لیے منصوبہ بندی کرے گی کیونکہ سوشلسٹ معاشرے میں ریاست تمام تجارت اور ذرائع پیداوار اور پیداوار کی مالک ہوتی ہے اس لیے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوتی ہے کہ کارخانوں میں کتنی پیداوار ہو سکتی ہے۔ اس کو اپنے ذرائع درآمد کا بھی علم ہوتا ہے، اب اگر دس لاکھ حاجیوں کو آنا ہے تو وہ دس لاکھ کیلئے جائے رہائش، خوراک، آمد و رفت کی سہولتیں اور اشیاء پر کنٹرول، یہ سب چیزیں پہلے سے طے کرے گی۔ مثال کے طور پر سوویت روس کو لیجیے وہاں پر کوئی ٹورسٹ داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس رہائش یعنی ہوٹل میں جگہ، ٹرانسپورٹ اور دوسری ضرورتوں کے مکمل کوائف موجود نہیں ہوتے اسی لیے سوویت یونین میں عام طور پر انفرادی ٹورسٹ کی بجائے ٹولیوں اور اور گروہوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اجتماعی انتظام میں آسانی ہوتی ہے۔

سعودی عرب میں اگر یہ تمام انتظامات زیادہ احسن طریقے سے حاصل ہوں تو پھر یہ عبادت بھی زیادہ پرلطف ہو گی اور وہ اسلام کی زیادہ خدمت ہو گی یا جواب ہے، اس لیے سوشلزم یا سوشلسٹ معاشرہ مذہب کی نفی نہیں کرتا بلکہ مذہب کے نام لیواؤں کے لیے بھی زیادہ سازگار ماحول پیدا کرتا ہے ویسے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں میں نے

جتنا بھی غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسافر کو جدے سے روانہ ہوتے وقت احرام نہیں باندھنا چاہیے اور عمرے کی نیت نہیں کرنی چاہیے بلکہ سادہ کپڑوں میں معلم کے پاس جاتے، جا کر سامان رکھے اور اس سے کہے کہ کمرے دکھا دے۔ اس سے کمرے دیکھنے کے بعد اور بھی ہوٹلوں وغیرہ میں چکر لگائے اور آٹھ دس گھنٹہ کی بھاگ دوڑ سے اچھا، سستا اور اپنی ضرورت کے مطابق رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن جب مسافر احرام میں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اگر مستورات بھی ہیں تو وہ پریشان حال ہوتا ہے اس کو ایک طرف عمرے کی جلدی ہوتی ہے دوسری طرف سامان رکھنے کی اور عمرے کے بعد آرام کرنے کی شدید خواہش جو معلم کے ہاتھ میں اس کو بے بس کر دیتی ہے اور جو بھی پہلے پناہ گاہ اس کو ملتی ہے اس کو وہ صبر شکر کے ساتھ قبول کر لیتا ہے لیکن بعد میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ لٹ گیا ہے اس کا پورا حج اس پچھتاوے اور احساس زیاں میں غارت ہو جاتا ہے۔

میں حیران ہوں کہ حج کے مسائل دعاؤں، طوافوں وغیرہ کے متعلق سینکڑوں نہیں تو درجنوں کتابیں ہیں لیکن کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو یہاں کی تکالیف کی صحیح عکاسی کرے۔ اور حج کے خواہش مند لوگوں کو یہ بتائے کہ یہاں کیسے ان کے ساتھ قدم قدم پر فریب ہوتا ہے دھوکا ہوتا ہے اور ان کو مالی طور پر لوٹنے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ کس طریقے سے محفوظ رہ سکتے ہیں یا نقصان اور تکالیف میں کمی کر سکتے ہیں۔ یہ جو صبر کی تلقین کی جاتی ہے یہ بھی دراصل یہاں کے لوگوں نے اپنی لوٹ کھسوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے رائج کر رکھی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ کوئی حاجی واپس جا کر لوگوں کو یہ نہیں بتاتا کہ اس کے ساتھ یہاں مقدس دیار میں کیسے کیسے مظالم ہوتے ہیں۔ زیادتیاں ہوئی ہیں اور کیسے بدتمیزی سہنی پڑی ہے۔ یہ حاجی کیوں نہیں سوچتا کہ جس مقدس مقام پر وہ آیا ہے اس کے تقدس نے اور اس مذہب کی تعلیمات نے یہاں کے انسانوں کو کیوں ایک نمونہ نہیں بنایا اور موجودہ حکومت جو اسلام کی اپنے کو متعصب داعی کے طور پر پیش کرتی ہے وہ اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتی۔ اس نے حاجیوں کے آرام کے لیے اور عبادت کی سہولتوں کے لیے لاتعداد اقدام کیے ہیں اور کر رہی ہے۔ اس کے لیے شاہ فیصل قابل تعریف

ہیں لیکن اسلام کی تعلیمات کا زندہ جاوید مظہر تو انسان ہیں۔ یہاں کا انسان اگر انسانیت کا صحیح نمونہ نہیں تو سڑکوں کی تعمیر، حرم کی توسیع، مسجد نبوی کی وسعتوں کا اہتمام ایک طرف اور بہتر انسان بنانے میں جو ناکامی ہوئی ہے وہ دوسری طرف اور یہ ناکامی کامیابیوں سے کہیں بھاری ہے

آج عصر کی نماز پڑھنے کے لیے پاکستان ہاؤس کی سامنے والی سیڑھی پر جگہ ملی۔ پاکستان ہاؤس اسی عمارت میں ہے جو شاہ ابن سعود یعنی فیصل کے بڑے بھائی نے پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو تحفتہً دی تھی اور وہ اس کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتا رہا۔ لیکن بعد میں حکومت پاکستان نے اس کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ اب وہاں لائبریری ہے اور پاکستان کے افسران کے لیے ایک قسم کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ اندر سے میاں شیفیع نکلا اس کو آواز دی وہ بھی آکر بیٹھ گیا نماز کے بعد گپ ہوتی رہی اس کے بعد ایک نوجوان گل سعید شاہ آگیا یہ ہمارے سرحد کے قبائلی علاقے کا رہنے والا ہے اور یہاں پچھلے چار سال سے مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ اس سے باتیں ہوتی رہیں وہ یہاں کی صحافت کے بارے میں بات کرتا رہا اس نے بتایا کہ کوئی بھی اخبار براہ راست حکومت کے قبضہ میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کوئی اخبار حکومت پر نکتہ چینی نہیں کرتا۔ امریکہ کے خلاف یہاں کچھ نہیں چھپتا اور نہ ہی روس کے خلاف زیادہ چھپتا ہے، البتہ کمیونزم کے نظریے کے خلاف لکھا جاتا ہے ویسے یہاں کی صحافت میانہ روی کی قائل ہے اور اسلامی ممالک کے اندرونی مسائل کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا جاتا اور نہ ہی ان کی پالیسیوں کے خلاف متشددانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ یہاں کے عدالتی نظام کے بارے میں بتاتا رہا کہ یہاں چوری اور قتل قریب قریب ختم ہو گئے ہیں اور حج کے موقعہ پر چوری کرنے والے عام طور پر غیر ملکی ہوتے ہیں جو حاجی کے روپ میں آتے ہیں ویسے اس نے بتایا کہ یہاں کی وزارت اطلاعات اس سلسلے میں خاصا مواد مہیا کر سکتی ہے کوشش کروں گا اگر ان سے مواد حاصل کیا جا سکے۔ ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ آپا سعیدہ اور عبدالرحیم نظر پڑے۔ ہم ان کے ہاں جانے کی کوشش کر ہی رہے تھے ان سے دو چار منٹ گفتگو ہوئی اور ان کو بتایا کہ ہم ابھی آئیں گے چنانچہ اس کے بعد میں ہوٹل آیا اور عائشہ کو

لے کر انکے ہاں فندق الیمانی گئے۔

۵/ فروری

آج مدینہ میں چھٹا دن ہے پانچ دن ہم نے یہاں گزارے ہیں اور پچیس نمازیں مکمل کر لی ہیں بلکہ اب فجر کی نماز سمیت تو چھبیس نمازیں ہوگئی ہیں آج تہجد کی اذان سے خاصا پہلے ہی ہم سب اٹھ بیٹھے چائے پی غسل کیا اور مسجد چلے گئے وہاں آج معمول سے زیادہ عبادت کی اور نوافل پڑھے تسبیح پھیری اور گڑگڑا کر دعا مانگی، یہاں عبادت کی کیفیت طاری رہتی ہے لیکن مسجد کے ہنگامے اس کیفیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن اب کچھ ہنگامہ اور ہجوم کم ہونا شروع ہوا ہے اس لیے مقابلتہً دھینگا مشتی بھی کم ہوگئی ہے اس لیے خیال ہے کہ آج ظہر سے پہلے اور اشراق کے بعد کے درمیانی وقفے میں جا کر نوافل ہی پڑھے جائیں اور درود وسلام بھیجا جائے۔

اب یہاں سے چل چلاؤ ہے اس لیے کھجوریں وغیرہ خریدنی ہیں ویسے اب تک یہاں سے ہم نے ایک ریال کی چیز بھی نہیں خریدی، فرانسیسی عطر وغیرہ اگر اچھا مل جائے تو وہ خریدنے کا ارادہ ہے، اسی طرح سے ایک ریڈیو گرام جو بیٹری سے بھی چلے اور مختصر حجم کا ہو جو اب سفر میں بھی اپنے ساتھ رکھ سکیں دیکھا ہے وہ تقریباً پانچ سو ریال میں ملتا ہے۔ یعنی ہمارے پندرہ سو روپے بنے وہ بھی جدے سے دیکھیں گے۔

مدینے میں بالعموم طبیعت عبادت کی طرف زیادہ مائل رہی ہے یہاں میں نے نمازیں زیادہ خشوع وخضوع سے پڑھی ہیں کسی نماز میں بھی میں اذان کے بعد مسجد میں نہیں پہنچا اللہ نے اپنے فضل وکرم سے پہلے ہی مسجد میں پہنچا دیا۔ طبیعت زیادہ رقیق ہوگئی ہے اور درود بھی بالعموم زبان پر رہتا ہے عائشہ بھی یہاں زیادہ عبادت میں مصروف ہے اور زیادہ مطمئن ہے اور مسرور رہے۔

آج کھجوریں لینے کے لیے یہاں کی کھجور منڈی میں گئے حاجی جوق در جوق وہاں خریداری کر رہے تھے لیکن قیمتیں ہیں کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، بغیر گٹھلی کے کھجور ۴/۱ ریال فی سیر ہے وہ دو سیر لی ہے ایک دوسری جھری دار کھجور ہے ان جھریوں کے متعلق خوش عقیدگی کے عالم میں دکاندار کہتے ہیں کہ یہ کلمہ طیبہ اس پر لکھا ہے اور حاجی ہیں کہ یقین کر لیتے ہیں وہ ۲/۱ ریال فی سیر اور ایک کھجور جس کے متعلق حدیث بھی ہے کہ اس میں تمام بیماریوں کی شفاء ہے جو عجوہ کہلاتی ہے وہ آٹھ ریال فی سیر یعنی ۲۴ روپے فی سیر لاتے ہیں۔ اب وزن اور بڑھ گیا ہے جیسے سامان کا وزن بڑھ رہا ہے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے کیونکہ اتنی تکلیف زیادہ ہوگی کہ یہ تمام سامان کندھوں اور ہاتھوں میں اٹھانا ہوگا

اب نور الحسن اور یوسف میرے ہمسفر پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر یہاں کے معلم کے پاس مہریں لگوانے کے لیے گئے ہیں کیونکہ یہاں کا خروج بھی ضروری ہے اور اس کے لیے مہریں لگوائی جاتی ہیں اور آتے ہیں تو پھر مسجد نبوی جاؤں گا۔ عائشہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہے چلی گئی ہے وہ اب نماز ظہر کے بعد آئے گی اور اس وقت کھانا کھائیں گے۔

ظہر کی نماز سے تقریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے پہلے مسجد میں آ گیا تھا اور یہ ڈیڑھ دو گھنٹے عبادت میں گزر گئے۔ ریاض الجنۃ میں تو صرف نفل ہی ادا کر سکا۔ ہاں دعا نہ مانگ سکا دعا میں نے دوسرے حصے میں مانگی، اس کے بعد سلام پڑھتا رہا اور شفاعتِ رسول کا گریہ وزاری کے ساتھ طالب ہوا۔ نماز کا وقت قریب آیا تو صفیں ترتیب پانے لگیں۔ میرے بائیں طرف ملائشیا کا ایک نوجوان اور اس کا چھ سات برس کا لڑکا بیٹھے ہیں اور آگے بخارا کا ایک مہاجر بیٹھا ہے۔ وہ بتانے لگا کہ وہ بیس برس کا تھا جب اس کا خاندان وہاں سے بھاگا تھا تب سے وہ مدینے میں آباد ہے لیکن اب بھی اس سے پوچھا جائے کہ وہ کہاں کا ہے تو اپنے کو بخارا کا ہی بتاتا ہے سوویت روس اگر اپنی مسلم ریاستوں سے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں حج کے لیے آنے کی اجازت دے تو اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زیادہ بہتر اثر ہوگا۔ اور شکوک وشبہات دور ہوں گے اب تو سوویت روس کا بیرونی اثرات کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔

۶ / فروری

غالباً منگل ہے تہجد کی اذان کو ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے مجھے مسجد میں آئے ہوئے آدھ گھنٹہ گزر گیا ہے اور اب رسول اللہ کے روضہ کے سرہانے کھڑے ہو کر دعا مانگی ہے اور ان کی شفاعت کا طالب ہوا ہوں یہاں مدینے میں عبادت کو جی چاہتا ہے۔ اگر یہاں یکسوئی میسر آتی تو اس سے زیادہ عبادت ہو سکتی تھی یہ بھی بصد مشکل آج موقعہ ملا ہے اس لیے کہ اب زائرین کا ہجوم کم ہونا شروع ہو گیا ہے اور اب قدرے بھیڑ کم ہونا شروع ہو گئی ہے چنانچہ کل رات بھی عشاء میں نے پہلی بار روضہ کے بائیں پہلو میں اطمینان کے ساتھ پڑھی ہے اور آج اطمینان سے دعا مانگی ہے، اللہ تعالےٰ قبول کرلے۔ یہاں مدینے میں کیفیت ہی دوسری ہے اسکی غالباً کئی ایک وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو رسول اللہ کا روضہ ہے یعنی ایک ذی لفنس متشکل شخصیت، ایک گوشت پوست، ایک ہم جلس کا ہم تصور لے کر آتے ہیں۔ اور اس کی عظمت ہم کو زیادہ متاثر کرتی ہے ہم یہ غیر شعوری طور پر سوچتے ہیں کہ وہ ہم جیسا ہوتے ہوئے بھی ہم سے کتنا عظیم تھا۔ اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا کچھ لطف زیادہ ہی آتا ہے پھر جب اس پر درود و سلام بھیجتے ہیں تو ایک ایسے پیکر کو بھیجتے ہیں جو ہم کو بہت پیارا معلوم ہوتا ہے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کی جو تصویر بنائی تو اسی لیے بنائی تھی کہ انسان کے تصور میں نیکی، شرافت، شفقت اور حسن کا جو بھی پیکر اعلیٰ وجود میں آسکتا تھا وہ تمام خصوصیات انھوں نے عیسیٰ کے مجسمے میں سمونے کی کوشش کی، اس کے ایک ایک رنگ اور ایک ایک عضو سے یہ تمام خصوصیات ٹپکتی ہیں، اس کی آنکھیں، اس کا نورانی چہرہ، اس کے خدوخال، ان کی تراش خراش، یہ سب بولتے ہیں۔ مسلمانوں نے تصویر کشی ممنوع کردی ورنہ ان کے ہاں بھی کچھ اسی قسم کی تصویر بنتی۔ لیکن اب جب ہم دعا کرتے ہیں اور رسول اللہ کو درود و صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور ان کی شفاعت کے طالب ہوتے ہیں تو ہمارے خیالوں میں جو تصویر ابھرتی ہے اس کے حسن، اسکی نیکی، شرافت اور اس کے جلال و جمال پر ہم نچھاور ہونے کو تیار ہو جاتے

اس خیالی پیکر کی کشش اور اس کی پشت پر صدیوں کی روایت، تاریخ اور آباؤ اجداد کی عبادت پرستش نے اسکی شخصیت کو اتنا مقناطیسی بنا دیا ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسان اس کے لیے جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔

کل عصر پڑھ کے فارغ ہوا تو سامنے پاکستان ہاؤس کی لائبریری میں چلا گیا۔ وہاں تازہ ترین اخبار ۲۹ جنوری کا تھا، کسی بھی ملک بالخصوص پاکستان کے لیے اس سے بڑی شرم کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ یہاں روزانہ اپنا اخبار بھی نہیں پہنچا سکتا اور اس کے باشندوں کو چھ دن پرانی اخباریں پڑھنے کو ملتی ہیں

آج ساتواں دن شروع ہو گیا ہے۔ اب چل چلاؤ ہے اور جیسے جیسے چل چلاؤ قریب آرہا ہے تو وہی سفر کے ہنگاموں اور صعوبتوں کے خیال سے پریشانی اور اضطراب بڑھ رہا ہے اور اسی لیے مسلسل یہی دعا رہی ہے اور اب بھی ہے کہ اے اللہ اس سفر کو آسان بنا دے اور خیر خیریت سے اپنے لوگوں میں لے جا۔ اب وہاں سے آخری اطلاع ۹ جنوری کی آئی ہوئی ہے اس کے بعد وہاں کے حالات کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے وجہ سے بھی سے پریشانی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے فضل وکرم سے جو ہم سفر ملے ہیں ان کی وجہ سے بھی سفر کی بوریت اور اذیت معدوم ہو گئی ہے نیز ہوٹل اچھا مل گیا ہے جس کی وجہ سے تکلیف و پریشانی سے محفوظ ہیں۔ یہاں کے ہوٹل کے ایک دن کے تجربے کے بعد عائشہ نے تھوڑا بہت نہانا بھی شروع کر دیا ہے۔ لیکن نہ معلوم یہاں کا پانی کیسا ہے کہ یہاں کی روٹی ہضم نہیں ہوتی اور پیٹ میں گڑبڑ کرتی رہتی ہے۔ عائشہ کو پیٹ میں درد کی مسلسل شکایت ہے اور مجھے بھی دو دن سے یہی تکلیف ہے۔ کل ظہر کی نماز کے دوران تو اس قدر شدت سے پیٹ میں درد ہے کہ نماز پڑھنی محال ہو گئی لیکن خدا نے اتنی ہمت اور صبر عطا کیا کہ نماز پوری ادا کر لی اس کے بعد کمرے میں گیا اور کھل کر اجابت ہوئی تو اس سے قدرے افاقہ ہوا۔

ہمارے ہم سفروں میں ایک نور الحسن ہے وہ تلہ گنگ کا رہنے والا ہے اور وہاں اس کا خاندان اور وہ خود بھی کاروبار کرتا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس کا پورا خاندان سخت متدین ہے اور دیوبندی

مکتب فکر کا ماننے والا ہے۔ دوسرے ہم سفر گوجرہ کے آڑھتی محمد یوسف ہیں وہ ۴۵، ۴۷ سال کے ہیں اور بڑے منجھے ہوئے آڑھتی ہیں سخت مزاح پسند اور طنز گو ہیں ان کا مزاح سفر کی کوفت کو مٹا دیتا ہے اور جو تھوڑا بہت وقت فراغت کا ملتا ہے وہ بہت ہی اچھا کٹ جاتا ہے ورنہ یہاں تو ہر وقت بھاگ دوڑ ہی ہوتی ہے

مجھے اس وقت ملک افضل کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ پاکستان کے پیر یہاں آتے ہیں، اور معلموں سے باقاعدہ کمیشن وصول کرتے ہیں کہ میں نے اپنے حاجی تمہیں بھجوائے ہیں۔ مثلاً اس نے جمیل شرق پوری کا نام لے کر بتایا کہ اس نے مرزوقی سے پانچ سو ریال ۲۶ حاجیوں کی کمیشن کے طور پر وصول کیے ہیں۔ اسی طرح سے تمام پیر یہ دھندا کرتے ہیں اور اس طرح سے مفت حج کر آتے ہیں۔ عرفات میں جب عام حاجی پانی کا ایک ایک لوٹا ایک ایک ریال میں خرید رہے تھے تو گولڑے والوں کے ہاں ٹینکیاں بھری پڑی تھیں یہ ٹھاٹھ باٹھ سب اس دھندے کا نتیجہ ہے کہ یہ اپنے مریدوں کو اپنے مخصوص معلموں کے پاس بھیجتے ہیں اور پھر ان سے کمیشن وصول کرتے ہیں اور اپنے معلموں سے حج کے دوران وی۔ آئی۔ پی سلوک حاصل کرتے ہیں۔

نماز پڑھ کے کمرے میں آیا۔ عائشہ آگے پہنچی ہوئی تھی۔ ناشتہ کیا اس کے بعد تھوڑی سی گپ کی، نہایا، شیو کی۔ عائشہ چاول اور مٹر پکا رہی ہے۔ یہاں پکانے کا کوئی سامان نہیں اس لیے خاصی تکلیف ہے میں لیٹا کتاب رفیق الحج پڑھ رہا تھا اس میں جنت البقیع میں دفن صحابہؓ کرام کا ذکر ہے اور یہ ہدایت ہے کہ ان کو بھی سلام بھیجا جائے۔ یہ پڑھتے پڑھتے تو مجھے خیال آیا کہ عربوں کے لیے تو اسلام ایک قومی مذہب کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ تمام صحابہ کرام ان کے ہیرو ٹھہرتے ہیں ان کو وہ سلام بھیجتے ہیں تو انکو اپنے ماضی کی درخشانی کا احساس ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ چونکہ دنیائے عرب میں ۹۹ فیصد مسلمان ہیں اس لیے کوئی ایسی اقلیت نہیں ہے جس کو ان ہیروؤں اور ان صحابہ کرام کے خلاف یا ویسے اسلام کے خلاف متشددانہ نفرت ہو۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کو لیجیے وہاں مسلمان جب اپنے علاقے سے باہر کے ہیرو کی پرستش کرتے ہیں تو ایک تو وہ خود اپنے علاقے سے ماورا۔ ہو جاتے ہیں۔ ان کی محبت اور

نفرت کے سوتے اس علاقے کی آبادی کے دوسرے عناصر سے بالکل مختلف ہوتے ہیں - ان کی خواہشیں اور تمنائیں غیر مسلم اکثریت سے مختلف ہوتی ہیں، ان کا جذباتی لگاؤ مختلف ہوتا ہے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثریت اس مسلم اقلیت کی حب الوطنی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے دنیائے عرب میں یہ اختلاف نہیں ہے اور یہ جذباتی کش مکش اور تضاد موجود نہیں اس لیے وہاں تصادم کی صورت اور شکل دوسری ہوتی ہے وہاں دین اور مذہب کے نام پر مشتعل کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے لیکن غیر عرب ممالک میں اس مسلم اقلیت کو مذہب کے نام پر منظم کرنا آسان ہوتا ہے یا پھر غیر عرب مسلم ممالک میں اسلامی نظام اور لادینی نظام کے لیے جدوجہد ایک زبردست تصادم کی صورت اختیار کر سکتی ہے - انڈونیشیا، ملائشیا، پاکستان، ترکی، ایران، افغانستان، ان تمام ممالک میں ایک نہ ایک صورت میں یہ تصادم اور کش مکش موجود ہے ویسے اس ہنگامہ پرور دور میں یہ امکانات موجود ہیں کہ سعودی عرب کی حکومت مستقبل قریب میں دنیائے اسلام کی قیادت کے لیے عملاً کوشش کرے گی اور ایک وقت آسکتا ہے جب یہ قیادت تمام اسلامی ممالک کے اندر اپنی عامل اور مؤثر LOBBIES پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے، اس وقت تمام حکومتیں اس قیادت کے رحم و کرم پر ہوں گی - جیسے ایک زمانے میں بہت سے ممالک کی حکومتیں امریکہ کے رحم و کرم پر ہوتی تھیں - ایک خیال تو یہ موجود ہے کہ امریکہ دنیائے اسلام اور دنیائے عرب میں سعودی عرب کے ذریعے خاصے مؤثر طریقے سے OPERATE کر رہا ہے مثال کے طور اس وقت بھی مصر سعودی عرب کے رحم و کرم پر ہے - کیونکہ سعودی عرب مصر کو سالانہ بطور امداد ایک خطیر رقم دے رہا ہے اسی طرح پاکستان بھی اس کی امداد سے مستفید ہو رہا ہے - لیبیا کا کرنل قذافی کون ہے، اس وقت امریکہ کو اسلامی عصبیت زندہ و تابندہ کر کے اسکی قیادت شاہ فیصل کے ہاتھ میں دینے سے فائدہ ہے، سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند اور انقلابی تحریکوں کی یلغار کو روکا جاسکتا ہے یا پھر ان کا رُخ موڑا جاسکتا ہے

اور سماجی تبدیلی کے مطالبے اور خواہشوں کو اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے اور ایسے نظام میں VESTED INTEREST کو تحفظ اور استحکام بخشا جا سکتا ہے امریکہ کے لیے دنیائے عرب کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس کے اپنے تیل کے ذخائر قریب الاختتام ہوتے جا رہے ہیں اور جیسے جیسے یہ ختم ہو رہے ہیں ویسے ہی مشرق وسطیٰ کے تیل کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور اس تیل پر قبضہ یا اس سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امریکہ کو اس خطے میں مؤثر اثر و رسوخ حاصل ہو، اس کے مقابلے میں روس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ اس تیل سے استفادہ نہ کر سکے۔ کیوں کہ اس استفادے کا مطلب دنیا میں اس کی بالادستی کو مزید تقویت ملنا ہے۔ اس لیے روس کا مفاد اس میں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایسی حکومتیں برسراقتدار ہوں جو امریکہ کو تیل سے استفادہ نہ کرنے دیں۔ اس لیے وہ مقابلتاً ایسی تحریکوں کا حامی ہے جو سماجی تبدیلی کا مطالبہ کر رہی ہوں، کیونکہ مشرق وسطےٰ میں تیل کی صنعت کو قومیائے بغیر سماجی تبدیلی کا مطالبہ بے معنی اور بہت حد تک لغو بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب کی حکومت بہت ہی متشدد طریقے سے کمیونزم کی مخالف ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے اندر کسی قسم کی سماجی تبدیلی کی تحریک پنپنے دے تو اس کا لازمی نتیجہ تیل کی صنعت کے متعلق امریکہ سے تصادم کی صورت میں نکلے گا۔

۷ر فروری

بدھ کا دن ہے، مدینہ میں یہ ہمارا آخری دن ہے، ۳۵ نمازیں اللہ کے فضل و کرم سے پوری ہو چکی ہیں اور آج باقی پانچ پوری ہو جائیں گی۔ آج رات بھر نیند نہیں آئی معلوم نہیں کیا وجہ

ہوئی اور تہجد سے تقریباً دو گھنٹے پہلے اٹھ بیٹھا اُٹھ کر روزنامچہ لکھا پھر پانی چولہے پر رکھا۔ کل شام سے چائے ختم ہوگئی ہے۔ چائے کی پڑیوں کا ڈبہ جو سو پڑیوں پر مشتمل ہوتا ہے وہ پانچ ریال میں آیا ہے اور چھوٹا ڈبہ ملتا نہیں ہے اس لیے آج صبح ہم نے کافی پی۔ وہ ڈبہ پڑا ہوا تھا وہ ساتھ کہاں لے جائیں مدینے کے پانی میں کچھ نہ کچھ خرابی ہے اس لیے ہر ایک کو پیٹ اور گلے کا کوئی نہ کوئی عارضہ لاحق ہے مجھے بھی مسلسل دو دو تین تین اجابتیں ہو جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود پیٹ بوجھل ہی رہتا ہے اس وقت معمول کے مطابق مسجد نبوی میں بیٹھا ہوں تہجد کے نوافل ادا کر چکا ہوں۔ آج نوافل میں بہت گڑگڑا کر دعا مانگی ہے کہ اے اللہ اس دنیا سے غربت اور بیماری ختم کر دے اور انسانوں کی بہتر نظام کے لیے جدوجہد کو کامیاب بنا۔ کیونکہ بہتر نظام زندگی عبادت کے لیے اور اللہ کی یاد کے لیے بھی ایک بہتر اور اچھی فضا پیدا کرے گا۔

کل رات عشاء کی نماز میں نے روضہ مبارک کے بائیں پہلو میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی سنتوں کے لیے ہی کھڑا ہوا کہ دھکم پیل شروع ہوگئی میں نے سنتوں کو بیچ میں ہی چھوڑ دیا اور جائے نماز اٹھا کر باہر سڑک پر آگیا وہاں زیادہ سکون اور اہتمام سے نماز ادا ہوئی اس لیے کہ وہاں لوگ خاموشی سے پڑھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکے دے کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے روضے کی جالی کو جس طرح چوما جاتا ہے۔ جس طرح کفن کے کپڑوں کو اس جالی کے ساتھ رگڑا جاتا ہے اگر یہاں کے خادم روکیں نہیں تو لوگ جالی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اس کو متبرک سمجھ کر ساتھ لیجائیں لیکن بھلا ہو شاہ فیصل کی وہابیت کا کہ اس نے پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ میں نے نماز اندر اس لیے ادا کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے بعد پوری مسجد کو اچھی طرح دیکھا جا سکے لیکن میں عشاء کے بعد جب ہوٹل آیا تو عائشہ بھی آگئی تھی۔ میں نے اس کو بتایا تو اس نے کہا وہ بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ہم دوبارہ مسجد میں آئے۔ اس وقت ہجوم قدرے کم تھا چنانچہ مسجد کے اندر سے ہم نے نکل کر باہر کا چکر لگایا۔ اس کے بعد مدینے کے تمام بازاروں میں گھومنے اور WINDOW SHOPPING کی رات ہم تقریباً دو گھنٹے مدینے کے کوچہ و بازار میں گھومتے رہے اور پورا مدینہ دیکھ لیا۔ اس کے بعد

تھک کر آئے تو ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ عائشہ نے شام کے لیے کچھ نہیں پکایا تھا چنانچہ جب ہم آئے تو انھوں نے انڈوں کی بھرجیا بنائی ہوئی تھی اور خود کھا کر کچھ ہمارے لیے رکھی ہوئی تھی، وہ ہم نے صبر شکر کر کے کھالی اور تھوڑا سا اطمینان ہوا، ورنہ ریال کی کمی نے تو ہمیں بے پناہ صرفہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔

آج مدینے سے جدہ کے لیے ہوائی جہاز کی ٹکٹوں کی توثیق کے لیے جانا ہے ابھی تک جو پروگرام بنایا ہے اس کے مطابق ہم کل ظہر اور عصر کے درمیان سامان نیچے لے آئیں گے اور ٹیکسی کر کے سامان اس پر رکھ دیں گے اور عصر پڑھنے چلے جائیں گے۔ عصر پڑھ کے سیدھے ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ پرواز کا وقت جدہ کے وقت کے مطابق سات بجے شام ہے۔

اس وقت دوپہر کے گیارہ بجے ہیں ٹکٹوں کی توثیق کروا آیا ہوں۔ اب کل عصر کی نماز کے بعد یہاں سے ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہوں گے۔ پیٹ میں پھر گڑبڑ ہے، چار اجابتیں ہو چکی ہیں۔ یہی حال عائشہ کا ہے اس کے پیٹ میں درد ہے ENTROVIAPAIN کی گولیاں لی ہیں۔ یہاں کے پانی میں نقص ہے کہ تمام لوگوں کو گلے اور پیٹ کے عارضے لاحق ہیں۔ اکثر حاجی بیماری کی شکایت کر رہے ہیں اب ہم فریضے کی تکمیل کے بالکل آخری قدموں پر ہیں اس لیے ڈر لگ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چالیس نمازیں پوری کروا دے کیونکہ ایک بھی نماز رہ جائے تو نفسیاتی طور پر حاجی شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے کے کمرے میں گوجرانوالہ کے ایک صنعت کار اور ان کی اہلیہ ٹھہری ہوئی ہیں۔ خاتون کو شدید بخار ہو گیا ہے اور وہ بے چاری فجر کی نماز باجماعت سے محروم رہ گئی ہے اس سے وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہے عائشہ بھی پریشان ہے اور دعا مانگ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو تندرست رکھے تاکہ یہ باقی کی نمازیں وہ خوش اسلوبی سے ادا کر سکے کیونکہ آج وہ مسجد نبوی جانے کے لیے ناشتہ کے بعد تیار ہو رہی تھی کہ پیٹ میں درد شروع ہو گیا اتنے میں آپا سعیدہ اور عبدالرحیم آگئے عائشہ ان کی خاطر تواضع میں لگ گئی اور میں مسجد کے لیے نکل آیا۔ کچھ دیر مختلف بازاروں میں گھوما WINDOW SHOPPING کی اور اب مسجد نبوی میں ظہر کے لیے آگیا ہوں، ابھی ظہر کی

اذان میں آدھ پون گھنٹہ باقی ہے۔

جاپان سعودی عرب کی پوری مارکیٹ پر پوری تیزی سے چھاتے جا رہا ہے۔ اب ٹیوٹا، مزدا، اور ڈاٹسن، امریکی کاروں سے کہیں زیادہ نظر آتی ہیں امریکی کاریں اب ٹیکسیوں کے پرانے ماڈلوں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں ویسے عام طور پر ٹیکسیاں امپالا، بیوک اور شیورلیٹ کی ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں جگہ زیادہ ہوتی ہے زیادہ سواریاں بیٹھ سکتی ہیں اور زیادہ سامان رکھا جا سکتا ہے ویسے مکہ سے جدہ یا جدہ سے مکہ اور مدینہ چلنے والی ٹیکسیاں عام طور پر امریکی ہی ہوتی ہیں۔ مزید برآں اب گھڑیوں میں SWISS گھڑیاں خال خال ہی نظر آتی ہیں اور پوری دکانیں CITIZEN اور SIEKO جیسی جاپانی گھڑیوں سے اٹی ہوتی ہیں، جوتے بھی جاپان سے درآمد ہو رہے ہیں کھلونے بہت بڑی تعداد میں جاپان سے آ رہے ہیں۔ جہاں تک دکانداروں اور تاجروں کا تعلق ہے ان میں بھی بہت بڑی تعداد غیر عربوں کی ہے۔ ان میں پنجابی بھی خاصی تعداد میں ہے۔

۸/ فروری

جمعرات ہے اور ابھی ابھی تہجد کی اذان ہوئی ہے اور میں نوافل پڑھ کے فارغ ہوا ہوں آج تو میں اذان سے بھی پہلے مسجد میں آ گیا تھا اور آ کے الوداعی نوافل پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی بخشش چاہی، اشراق کے بعد جب روضہ رسول پر ہجوم قدرے کم ہوتا ہے تو وہاں بھی دعا کے لیے آؤں گا۔ میں نے اور عائشہ نے یہی پروگرام بنایا ہے یہ عجیب و غریب کیفیت ہے۔ جب جمعہ سے چلنے کے دن آئے تھے۔ تو بھی مجھ پر بہت ہی رقت طاری تھی۔ چنانچہ آخری عمرے اور الوداعی طواف میں میری کیفیت واقعی رقیق تھی۔ لیکن

یہاں مسجد نبوی میں آٹھوں دن قریب قریب یہی کیفیت رہی ہے۔ اس کیفیت کی عقلی طور پر کیا توجیہہ ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک بات ہے کہ کم از کم انسانی بے کسی اور بے بسی کی وجہ سے اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کی بنا پر جو ایک بوجھ ہوتا ہے وہ کم ہو جاتا ہے اور انسان خود کو ہلکا محسوس کرتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اب اس کی مرادیں پوری ہوئیں کہ ہوئیں، وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کی توقع میں مگن ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ یہ پوری ہو بھی جاتی ہیں اس وقت انسان کا جذبۂ عبودیت اور بیدار ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایک گونہ جذبۂ عبودیت انسان میں موجود ہے اس جذبے کا اظہار کیسے ہوتا ہے یہ مختلف راہیں اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن جذبۂ عبودیت کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب روزنامچہ لکھنے کی فرصت کم ہی ہو گی کہ اب سفر کے ہنگامے پوری تیزی سے شروع ہو رہے ہیں اور اب اگلے دو تین دن یا اس سے بھی زیادہ جب تک کہ لاہور اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا اس وقت تک سفر کے ہنگامے جاری رہیں گے دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس سفر کو آسان کر دے

۹ر فروری

۸ر فروری کا پورا دن ہنگاموں اور سفر میں گزرا روزنامچہ لکھنے کی فرصت کس کو تھی۔ یہ دن تو اضطراب اور پریشانی کا دن تھا، یہ دن تھا خدشات کا، غیر یقینی مستقبل کا، سفر کے ڈر اور خوف کا۔ لیکن اب جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو خدا کے فضل سے بے حد مطمئن و مسرور ہوں دہی۔ صبح تہجد کا وقت ہے میں جدہ کے ہوائی اڈہ کے کھلے میدان میں بستر پر بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ مجھے ایک گھنٹہ بیدار ہوتے ہو گیا ہے اُٹھ کر وضو کیا اور سب سے پہلے عشاء کی نماز ادا کی، اس لیے کہ کل رات ہنگاموں اور بھاگ دوڑ میں ادا نہ کر سکا۔ اس کے بعد چائے

پینے کے لیے باہر گیا- چائے پی اور دکانیں جو اس وقت بھی کھلی ہوئی تھیں پر تاک جھانک کی، عائشہ سو رہی تھی، آکر میں نے ہمسفروں کے ساتھ گپ کی پھر اس کے بعد جاکر نہایا، وضو کیا اور تہجد کے نوافل پڑھے، اب عائشہ وضو کرنے گئی ہے تو میں یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں۔

پہلے کل کی روئیداد لکھ لوں۔ فجر کی نماز کے بعد گھر آیا، ناشتہ کیا- اس کے بعد سامان درست کیا- سوٹ کیس کو ترتیب دی- اس کے بعد نہایا، شیو کی، عائشہ بھی نہائی وضو کیا اور تیار ہو کر ہم مسجد نبوی میں الوداعی دعاؤں اور نوافل کے لیے چلے گئے آج مسجد نبوی کو خالی کرا لیا گیا تھا اور روضے کے ساتھ کا حصہ بھی خالی پڑا تھا اور پولیس نے گھیرا ہوا تھا- شاہ فیصل روضے پر آرہے تھے- چنانچہ جس وقت آیا تو میں بھی وہیں موجود تھا، اس نے آکر اپنے عمائدین کے ہمراہ دو نوافل ادا کیے اور معائنہ کیا اور واپس چلا گیا، میں نے اور عائشہ نے گڑگڑا کر دعا مانگی اور بخشش چاہی تمام ستونوں کے پاس نوافل بھی ادا کیے جس طرح سے یہاں نوافل ادا کرنے کے واسطے جگہ کے لیے دھکم پیل ہوتی ہے اس سے تمام مزہ کرکرا ہوجاتا ہے- بڑی رقت طاری رہی- بالآخر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبادت کر کے باہر نکلے تو عائشہ RELAX کرنے کے موڈ میں تھی چنانچہ ہم نے آئس کریم کھائی بہت لذیذ تھی، اس کے بعد تھوڑا بہت گھوم کر ہوٹل واپس آئے تو آپا سعیدہ اور عبدالرحیم آگئے ان کی کوکا کولا سے تواضع کی ان کے ساتھ گپ ہوتی رہی اس دوران عائشہ نے انڈے مٹر اور آلو کی بھرجیا بنائی، پھر ظہر کی نماز پڑھنے گئے نماز پڑھ کے میں فوراً آگیا اور آکر میں نے گیس والے چولہے سے گیس ختم کرنے کے لیے اسے کھول دیا- تاکہ گیس ختم ہوجائے اور پھر ہم بالآخر سامان لاد کر ٹیکسی میں سوار ہو گئے اور ہم مدینہ ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوتے- ہم سب خاموش تھے سکتہ ہم پر طاری تھا، اسی خاموش اور سکتے کے عالم میں ہم مدینہ کی حدود سے باہر نکل آئے، نورالحسن نے مدینہ کی طرف رخ کر کے مدینہ کو الوداع کہنا شروع کیا اسی مدینہ کو جہاں ہم نے چالیس نمازیں ادا کیں، جہاں ہم نے گریہ وزاری کی تھی- جہاں ہم نے رو رو کر دعائیں مانگی تھیں- جہاں ہم نے مسجد نبوی کے ایک ایک ستون کے سامنے کھڑے ہو کر نوافل ادا کیے تھے اور اسی مدینہ کو ہم الوداع کہہ رہے تھے اسی مدینہ کو خدا حافظ کہہ رہے تھے جہاں نبیوں

کے نبی جہاں ختم المرسلین، جہاں محبوب خدا کا روضہ ہے۔
نور الحسن دعا کر رہا تھا۔ الوداع کہہ رہا تھا، ہم سب دستِ بدعا تھے ہم سب گریہ وزاری کر رہے تھے یہ گریہ وزاری نہ تھی۔ یہ دل کا چیرنا تھا، یہ خون اُگلنا تھا۔ جیسے جیسے لمحات گزر رہے تھے، ہماری ہچکی بندھتی چلی جارہی تھی، ہمارے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے تا آنکہ یہ آنسو رک گئے ہماری آنکھوں میں مزید آنسو شاید باقی نہ رہے تھے، یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ہم رسول خدا سے ابھی ابھی جدا ہوتے ہیں اور یہ جدائی کا غم ناقابل برداشت تھا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

میرے اندر کا مسلمان پوری طرح اس وقت بیدار تھا، وہی مسلمان جس کی پشت پر صدیوں کی روایات، عبادات کا تسلسل لدا ہوا تھا، جو صدیوں سے اسلام کی حقانیت پر بغیر سوچے سمجھے یقین لایا ہوا تھا۔ جو سینکڑوں سالوں سے جنّت کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا اور جہنم کے خوف سے لرزاں و ترساں تھا، ماضی کی ایک روایت ہو تو اس کا ذکر ہو، بہر حال ہم اپنی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور مجھے رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔

حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں
ہم کہاں، تم کہاں یہ رات کہاں

مدینے کے ہوائی اڈے کی طرف بڑھنے شروع ہوئے، ابھی نصف ہی گئے ہوں گے کہ ٹیکسی پنکچر ہوگئی، اب سبھی پریشان ہو گئے۔ ٹیکسی والے کے پاس پورا سامان نہیں تھا اور یہ لق و دق صحرا تھا۔ اردگرد کوئی آبادی، کوئی دکان، کوئی ذی نفس نہ تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے اور چند لمحے پہلے جو ہم مدینہ چھوڑنے پر پریشان ہو رہے تھے، گریہ وزاری کر رہے تھے، اب مدینہ کے ہوائی اڈہ پر پہنچنے کے لیے بے تاب و بے قرار تھے، یہ انسانی طبیعتوں کے عجیب و غریب تضاد ہیں، انسان کبھی تو پگھل کر موم ہو جاتا ہے اور کبھی پتھر کی طرح سخت

جان ہو جاتا ہے۔

اب ہم دعائیں مانگ رہے تھے کہ کوئی ٹیکسی والا گزرے اور وہ رک جائے تو ہماری مشکل آسان ہو، خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی۔ ہم وقت پر ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔